NOVEMBER
2022

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

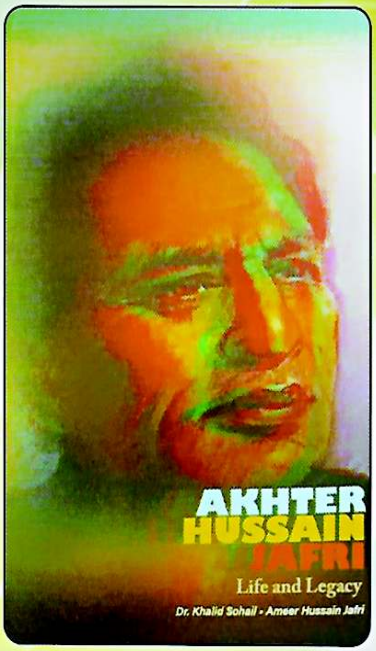
AKHTER
HUSSAIN
JAFRI
Life and Legacy
Dr. Khalid Sohail - Ameer Hussain Jafri

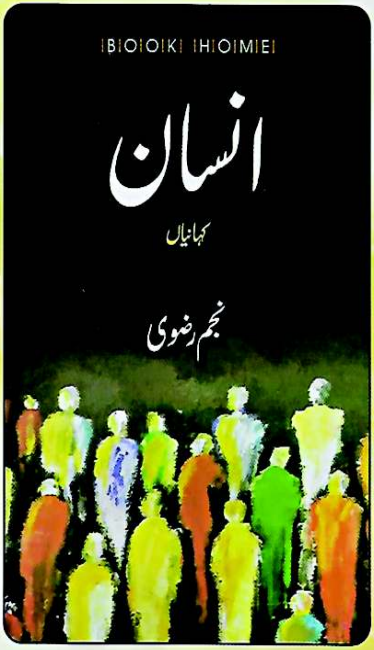
انسان
کہانیاں
نجم رضوی

جوگی

انگ یہ کِس کے رَنگ رچائے
آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو
کِس خوشبُو سے تن مہکائے
انگ یہ کِس کے رَنگ رچائے
آنکھ کی تہِ میں چَراغ سجائے
چادرِ آب لیے بیٹھے ہو
انگ یہ کِس کے رنگ رچائے
آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شذرہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - نومبر 2022 - شمارہ نمبر: 11

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: علامہ محمد اقبال، احمد ندیم قاسمی
قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور۔ 53700
فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر و پبلشر نے ٹریک لینڈ ملٹی پرنٹرز 16 کلومیٹر رنگ روڈ نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	اکرم سحر فارانی، فرحت عباس، محمود کیفی	7 تا 9
2	نعت	نسیم سحر، محمد یٰسین قمر، گلزار بخاری، سید ریاض حسین زیدی تابش کمال، فرحت عباس، ذکی طارق، اکرم ناصر اعجاز دانش، سرور حسین نقشبندی، ظہور چوہان، اعجاز رضوی	10 تا 21
3	قصیدہ	شاعر علی شاعر	22 تا 27
4	منقبت	سید عارف معین بلے	28 تا 30
5	عقیدت	افتخار شاہد، مرزا آصف رسول	31 تا 32
6	رباعیات	خالد علیم	33
7	مضامین	خالد سہیل، فرحت عباس شاہ، ظفر معین بلے جعفری علی رضا، کلیم خارجی، محمد احمد، شاہد اشرف، عادل سعید قریشی ثمینہ سید، مظفر اقبال	34 تا 92
8	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	93 تا 101
9	شاعر امروز	برار شاہ، حمزہ یعقوب (شاہد مالکی)	102 تا 107
10	مباحثہ	فیصل زمان چشتی	108 تا 117

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
11	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی انور شعور، حسن عسکری کاظمی، سحر انصاری، سید ریاض حسین زیدی نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، رشید آفرین، راحت سرحدی منظور ثاقب، ممتاز اطہر، اقبال سروبہ، مقصود جعفری، یعقوب پرواز شوکت محمود شوکت، سعد اللہ شاہ، افتخار شاہد، مسعود احمد، شبہ طراز فرحت عباس، اظہر حسن، محمد اشرف کمال، قیوم طاہر، احمد جلیل رضا اللہ حیدر، عقیل رحمانی، حریم حیدر، ہمایوں پرویز شاہد ارشد محمود ارشد، اکرم ناصر، حسنین سحر، سید فرخ رضا ترمذی بشیر احمد حبیب، پروین سجل، ذکی طارق، اشرف نقوی، آفتاب خان فیض رسول فیضان، نیاز جیراجپوری، شاہد ماکلی، اعجاز روشن محمد سلیم ساگر، فخر عباس، اکرم جاذب، کیفی قلندر، حکیم خان حکیم نور کمال شاہ، راجہ عبدالقیوم، احمد سجاد بابر، اسد اعوان، وسیم جبران علمدار حسین، عاصم اعجاز، شہاب صفدر، ازور شیرازی سعدیہ بشیر، امتیاز انجم، ارسلان ساحل، شبیر نازش امر مہکی، محمد علی ایاز، سید ضیا حسین، امجد بابر، کوکی گل رافعہ ارم مرزا، اعجاز دانش، شہاب اللہ شہاب، رانا محمد شاہد	118 تا 187
12	افسانے	ابدال بیلا، [کونستان پوستوفسکی / مترجم: حنیف باوا] وردانہ نوشین خان، آشا تھ کنول، وسیم جبران، عاصم بخاری	188 تا 211
13	طنز و مزاح / خاکے	رخشندہ نوید، ناصر محمود ملک، سیدہ آمنہ ریاض	212 تا 223
14	نظمیں	[خالد احمد / مترجم: تعبیر علی]، امجد اسلام امجد، گلزار بخاری [مارگریٹ ایٹ ووڈ / مترجم: حامد یزدانی]، شہزاد نیر اکرم سحر فارانی، صغیر احمد صغیر، امجد بابر، نائلہ راٹھور عتیق احمد، عاطف جاوید عاطف، رجب علی رجب	224 تا 236
15	خطوط	نسیم سحر، راجہ عبدالقیوم، اشرف کمال، فیض رسول فیضان، رانا محمد شاہد	237 تا 241

حمد

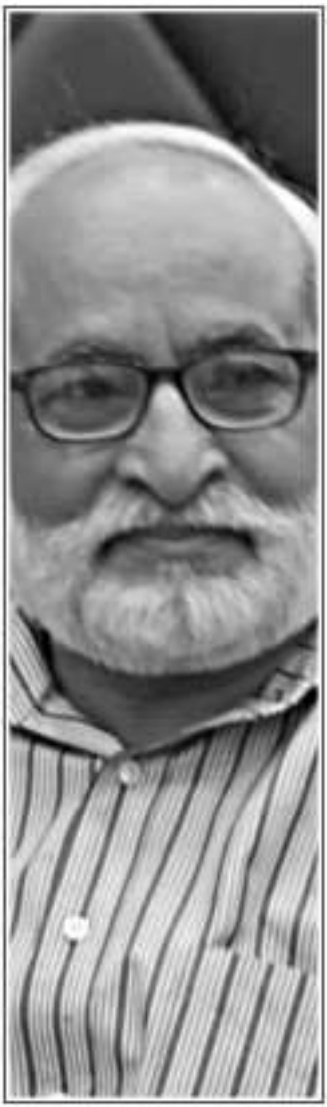

خالقِ کون و مکاں ربُ العلیٰ ہے تیری ذات
سارا عالم ہے گدا، حاجت روا ہے تیری ذات

تیری قدرت سے رواں ہیں زندگی کے کارواں
مشکلوں کی راہ میں مشکل کشا ہے تیری ذات

غُنچہ و گُل میں ہے خُوشبُو چاند تاروں میں چمک
دَر حقیقت قسمتِ ارض و سما ہے تیری ذات

ورطۂ حیرت میں ہیں سارے جہاں کے فلسفی
ہر جگہ ہر آن کیسے رونما ہے تیری ذات

شب کی چادر پر سجاتا ہے ستاروں کے چراغ
صبحِ تاباں میں رُخِ شمس الضحیٰ ہے تیری ذات

حُسن تیرا دور تر ہے سرحدِ اِدراک سے
عشق کی نظروں میں لیکن جلوہ زا ہے تیری ذات

بخش دینا اپنی رحمت سے سحرؔ کی لغزشیں
میرے مولا مالکِ روزِ جزا ہے تیری ذات

اکرم سحر فارانی

حمد

اللہ کی عطا یہ عطائے عظیم ہے
رکھا ہوا جہان میں مجھ کو نعیم ہے

تو جانتا ہے ، تو ہی خبیر و علیم ہے
قرآن میں جو آیا الف لام میم ہے

اے خالقِ کریم تو کتنا کریم ہے
کوئی ترا خلیل تو کوئی کلیم ہے

مولائے کائنات ، کرم کا ہوں منتظر
فردِ گناہ میری اگرچہ ضخیم ہے

لاریب میرا تیرے سوا کوئی بھی نہیں
لاریب تو ہی صاحبِ لطفِ عظیم ہے

فرحتؔ خطا شعار کی ہو التجا قبول
اس کو بھی بخش دے تو غفورالرحیم ہے

فرحت عباس

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

بستی تک پہنچے ، جھرنا خوشبو کا
اے قادر ہادی ، اے غالب مولا

حمد

جو مری سوچ کی دُنیا سے ہے باہر، تُو ہے
دیکھ پائے نہ جسے آنکھ وہ منظر تُو ہے
ایک قطرہ ہوں اگر میں تو سمندر تُو ہے
اِس میں کچھ شک بھی نہیں اعلیٰ و برتر تُو ہے
تیرے ہونے سے ہے سب کچھ کہ سبب تُو ہی تو ہے
پالتا ہے جو جہاں بھر کو وہ رب تُو ہی تو ہے

ہر مُصیبت میں جسے میں نے پُکارا، تُو ہے
اپنے بندوں کا فقط ایک سہارا تُو ہے
رنگ پیارے ہیں سبھی تیرے کہ پیارا تُو ہے
میں تو یہ جان کے خُوش ہوں کہ ہمارا تُو ہے
ساتھ ہو کے بھی جو رہتا ہے جُدا، تُو ہی تو ہے
خلق جس نے ہیں کیے ارض و سما، تُو ہی تو ہے

زندگی تیرے ہی دم سے ہے، زمانہ تُو ہے
جو دِکھائی نہیں دیتا وہ خزانہ تُو ہے
صِرف غافِل ہی سمجھتے ہیں فسانہ تُو ہے
کوئی ہمسر نہیں تیرا کہ یگانہ تُو ہے
جس سے سب لوگ ہی کرتے ہیں دُعا، تُو ہی تو ہے
کوئی مانے کہ نہ مانے وہ خُدا تُو ہی تو ہے

محمود کیفی

نعتؐ

آقا حضورؐ کا جو ثنا خوان ہو گیا
وہ شاملِ قبیلۂ حسّان ہو گیا

کر پایا جو بھی پیروی سیرتِ رسولؐ
گویا نئے سِرے سے مسلمان ہو گیا

ابجد کے سب حروف ردیفوں میں ڈھل گئے
صد شُکر ، میرا نعتیہ دیوان ہو گیا!

زادِ سفر میں عشقِ نبیؐ لے کے جب چلا
میرا سفر کٹھن تھا جو آسان ہو گیا

یوں میرے دل میں اُس کی ہوئی ہے بڑھوتری
عشقِ رسلؐ جو گُل تھا، گلستان ہو گیا

اللہ کے حبیبؐ کی مِدحت کے وِرد سے
بے شک مری نجات کا سامان ہو گیا

لا رَیب اُسے بشارتِ جنت ملی نسیم
جو حُرمتِ رسولؐ پہ قربان ہو گیا

نسیم سحر

نعتؐ

یادِ خیرِؐ شیم میں ہوتی ہے
وہ جو خوشبو حرم میں ہوتی ہے

سوچ ہر آن نعت کے صدقے
اک فضائے نعم میں ہوتی ہے

ذکر اُنؐ کا سرور دیتا ہے
زندگی جب الم میں ہوتی ہے

گنبدِ سبز کے تصور سے
روشنی چشمِ نم میں ہوتی ہے

یہ ہے فیضان اُنؐ کی مدحت کا
ضو جو خطِ قلم میں ہوتی ہے

جب بھی سوچو مدینے والے کو
اک روانی قلم میں ہوتی ہے

کہکشاؤں کی کہکشاں گویا
اُنؐ کے نقشِ قدم میں ہوتی ہے

کیا بتاؤں قمر عطا کیا کیا
حبِّ میرِؐ امم میں ہوتی ہے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

ان کی توصیف کرنے لگتے ہیں
لفظ خوشبو سے بھرنے لگتے ہیں

نام اُن کا زبان پہ آتا ہے
دل پہ تارے اُترنے لگتے ہیں

ان کی یادوں کے مہرباں موسم
شہرِ جاں سے گزرنے لگتے ہیں

ان کی سوچوں سے رنج کے لمحے
ٹل کے خود ہی بکھرنے لگتے ہیں

ہم نے ان کی نگاہ سے جانا
کیوں مقدر سنورنے لگتے ہیں

ان کے قدموں کی گلفشانی سے
راستے خود نکھرنے لگتے ہیں

چھو کے افکار ان کی چوکھٹ کو
عرش پر پاؤں دھرنے لگتے ہیں

صبح طیبہ بڑھائے ہمت کو
شامِ غم سے جو ڈرنے لگتے ہیں

گلزار بخاری

نعتؐ

خدایا ثنا خوانی کرتا رہوں
دما دم میں دم ان کا بھرتا رہوں

وہی میری جاں ہیں، وہی میری آن
انہیں کے لیے جیتا مرتا رہوں

اجالے مرے دل پہ ہوں حکمراں
میں شمس الضحیٰ سے سنورتا رہوں

رہوں ان کی تعریف میں منہمک
میں بنتا، سنورتا، سدھرتا رہوں

ملے نعت گوئی میں کیف و سرور
میں جامِ تمنا کو بھرتا رہوں

مسافت مدینے کی درکار ہے
میں خاک اس کی آنکھوں میں بھرتا رہوں

ثنائے نبیؐ کے ہوں جلسے تمام
بصد شوق شرکت میں کرتا رہوں

ریاضت مری کام آئے ریاض
میں راہِ نبیؐ سے گزرتا رہوں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

برقرار و برگزیدہ ، آپؐ برتر ، بُردبار
آپؐ صادق، آپؐ ناطق، مرتضٰی، خیرُالوریٰ

شاہِ طیبہ، شاہِ شاہاں ، شاہ و شرفِ دو جہاں
شان و فخرِ انبیاء، شاہ عُلا ، خیرُالوریٰ

باکمال و بارسُوخ و با وقار و بامُراد
بامروّت ، بانصیب ، باصفا ، خیرُالوریٰ

سرفراز و سرپرست و سربراہ و سرگروہ
سرخوش و سرخود ، سراسر ، آسرا ، خیرُالوریٰ

آئینہ چشم ، آئینہ دل ، آئینہ در آئینہ
آئینہ رو ، آئینہ لب ، آشنا ، خیرُالوریٰ

کِس نے رکھی ہے بِنائے لا الہ تابش کمال
اِبتدا و اِنتہا و مُقتدا خیرُالوریٰ

تابش کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت کے
کس کے در کا پہرہ دینے ، جاگیں چوکی دار

نعتؐ

ہر طرف نور ہے جلوہ گر آپؐ سے
لے رہی ہے ضیا ہر نظر آپؐ سے

آپؐ ہیں پیشوا ، آپؐ ہیں رہنما
منزلیں آپؐ سے ، رہ گزر آپؐ سے

شاہِ والا حَشَم ، حُسنِ باغِ ارم
جانِ کُن ہے کرم مستقر آپؐ سے

وہ جو معبود ہے، وہ جو مسجود ہے
ہم نے پائی ہے اس کی خبر آپؐ سے

آپؐ ہی کے وسیلے سے مانگیں سدا
ہر دعا میں ہے رُوحِ اثر آپؐ سے

آپؐ کی ذاتِ اقدسؐ کا فیضان ہے
سارے عالم ہوئے معتبر آپؐ سے

رحمتِ عالمیںؐ ، سیّد المرسلیںؐ!
میری بخشش ہے الحضر آپؐ سے

شاہِؐ دنیا و دیں ، دلربا ، دلنشیں
میرا سب کارِ فکر و ہنر آپ سے

سیدِؐ بحر و بر ، حاکمِؐ خشک و تر
سارے عالم کے لعل و گہر آپؐ سے

دونوں عالم کو جن سے ملی ہے بقا
فاطمہؑ اور علیؑ کا وہ گھر آپؐ سے

اسمِ محبوبِؐ ربّ ہے وظیفہ مرا
اب تو فرحتؔ کے شام و سحر آپؐ سے

فرحت عباس

نعتؐ

نہ ہوں کیوں سب سے یکتا میرے آقا
کہ ہیں رحمت سراپا میرے آقا

رسولوں اور نبیوں میں ہیں سب سے
معظم اور اعلیٰ میرے آقا

بہت مشکل ہے مانا روزِ محشر
کریں گے پار بیڑا میرے آقا

یہ جانا میں نے لولاکَ لما سے
ترا ہونا ہیں دنیا میرے آقا

ذرا دیکھو کیا ان کا ہوسکا میں
مجھے کہتے تھے اپنا میرے آقا

مرے بیمار ایماں کو شفا دی
غضب کے ہیں مسیحا میرے آقا

مری ہی فکر میں رہتے تھے ہر دم
تھے کرتے پیار کتنا میرے آقا

معافی دے دی جانی دشمنوں کو
تھے کتنے رحم فرما میرے آقا

برا ہوتا مرا انجامِ محشر
نہ بنتے جو سہارا میرے آقا

میں ہوتا آج کیا، سوچو جو ہوتے
مری جانِ تمنا میرے آقا

بہ شانِ رحمتہ اللعالمینی
ہیں کل خلقت کے ملجا میرے آقا

ذکی طارق

نعتؐ

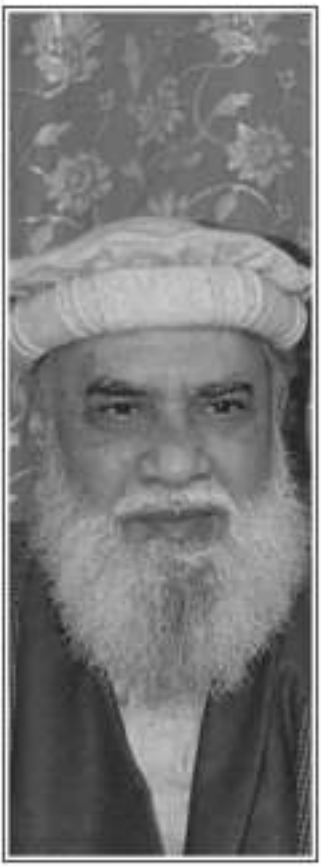

تمہاری چاہ میں ہر کل کو بے کل کر لیا میں نے
یہ رتبہ سیرت حسان میں ڈھل کر لیا میں نے

یہی کہتے سنا سب کو کہ دنیا اک معمہ ہے
مگر تجھ بن کسے ہمت کہے حل کر لیا میں نے

تمہارے نام کے موتی پرو کر سانس ڈوری میں
منور اپنے جیون کا ہر اک پل کر لیا میں نے

تجھے تخلیق کر کے خود خدا بھی خوش ہوا ہو گا
کہ جو شہکار سوچا تھا مکمل کر لیا میں نے

تری تعلیم قرآنی سے روگردانیاں کر کے
درندہ بن گیا جیون کو جنگل کر لیا میں نے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بیٹھے ہیں اُن کے دَر سے لگے سر دَر آستیں
دیدہ درا تمام ، دریدہ دہن تمام

نعتؐ

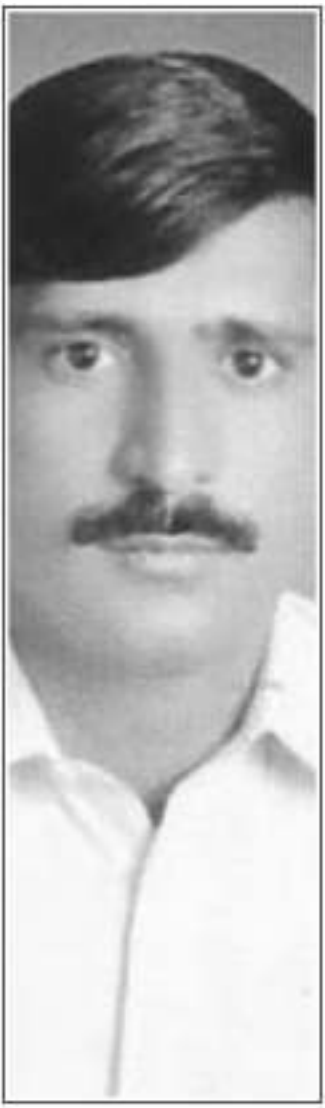

ہر دل میں موجزن ہے حبیبِؐ خدا کی دھوم
چاروں طرف فضا میں ہے صلِ علیٰ کی دھوم

دنیا میں جس جگہ بھی ہے انسان کا وجود
پہنچی وہیں وہیں شہِ بدرالدجیٰ کی دھوم

یہ حسنِ کائنات بھی ہے آپؐ کے طفیل
ہے مہر و ماہتاب میں انؐ کی ضیا کی دھوم

اے فخرِ انبیاؐ تری نعلین کی قسم
سدرہ پہ بھی سنی ہے ترےؐ نقشِ پا کی دھوم

پہنچے ہیں بادشاہ بھی خیرات مانگنے
سن کر مرے حضورؐ کی جود و سخا کی دھوم

مکہ کی سرزمیں پہ ہوا آپؐ کا ظہور
پہنچی عرب سے دور شہِ انبیاؐ کی دھوم

ہر عہد پہ محیط رہے گی ابد تلک
دانش رسولِ پاکؐ کی فہم و ذکا کی دھوم

اعجاز دانش

نعتؐ

اولیں آپ ہیں، آخریں آپ ہیں
سید و سرورِ مرسلیں آپ ہیں

آپ کو یہ بھی اعزاز بخشا گیا
حشر میں شافعِ مذنبیں آپ ہیں

جن کا سکہ رواں دو جہانوں میں ہے
وہ شہِ آسمان و زمیں آپ ہیں

دو جہانوں میں ہے آسرا آپ کا
حامیٔ سرورِ کمتریں آپ ہیں

ساری مخلوق کے رہبر و رہنما
جن کے سارے ہیں زیرِ نگیں آپ ہیں

آپ کو ہر جہاں کی خبر دی گئی
اس لیے رحمتِ عالمیں آپ ہیں

رشک سے دیکھتا ہے اسے آسماں
جس جگہ میرے آقا! مکیں آپ ہیں

آپ سا کس نے پایا ہے عز و شرف
آدمیت میں افضل تریں آپ ہیں

سورۂ والضحیٰ میں یہ اعلان ہے
سب حسینوں سے بڑھ کر حسیں آپ ہیں

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

اے خواہشِ دل! افسردہ نہ ہو، ہے تیرا ٹھکانہ اُس دَر پر
تھک ہار کے آخر جھکتا ہے سارا ہی زمانہ اُس دَر پر

میں چاہے پریشاں حال رہوں، چاہے دنیا کے نشانے پر
مجھے دیکھیں والیٔ کون و مکاں، رہے آنا جانا اُس دَر پر

ورنہ تو کئی شکوے تھے مجھے، ہر بات پہ کُڑھنے لگتا تھا
مرا مقصد کیا ہے جینے کا، خود کو پہچانا اُس دَر پر

لوگوں کو دکھا کر کیا حاصل، مٹی میں ملا کر کیا حاصل
جہاں موتیوں میں ڈھل جاتے ہیں تم اشک بہانا اُس دَر پر

بھٹکو نہ ظہور اِن راہوں میں، بہتر ہے ابھی خاموش رہو
فریاد وہیں پوری ہو گی، آواز لگانا اُس دَر پر

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر نفس ولولۂ و حوصلۂ مدحِ رسولؐ
رافعِ تذکرۂ خیر ورا سے مانگا

نعتؐ

ترے کرم سے بھرم رہ گیا ہمارا بھی
وگرنہ ٹوٹ گرا تھا یہ اک ستارا بھی

میں چاہتا ہوں لکھوں نعت ایسے لفظوں سے
کہ شعر شعر سے ہو جائے استخارا بھی

بہت جھکا ہوں مگر خاک پر گرا تو نہیں
کہ اپنا ہوتے ہوئے بھی ہوں میں تمھارا بھی

یہ خاک دان کسی روز آگ پکڑے گا
لہو نے دیکھا ہے اک مدحتی شرارا بھی

میں اُن کو مانتا ہوں اور ہی طریقے سے
کہ وہ سہارا بھی ہیں رہنما ستارا بھی

بپھرتی موج مجھے کیا ڈرائے گی لوگو
مرے سفینے کے ہمراہ ہے کنارا بھی

لکھی جو نعت تو اعجازؔ دل پکار اُٹھا
کہ میں نے توڑ دیا نظم کا اجارا بھی

اعجاز رضوی

قصیدہ حضورؐ کا

ہے آمدِ بہار بھی چرچا حضور کا
کرتا ہے ذکرِ خیر بھی سبزہ حضور کا

شاخیں بھی جھوم اُٹھیں محمد کے نام پر
پڑھتے ہیں مہر و ماہ بھی کلمہ حضور کا

تعریف کر رہے ہیں خیاباں بھی، دشت بھی
گلزار لکھ رہے ہیں سراپا حضور کا

توصیف کر رہے ہیں چمن زار و کوہسار
پایا ہے وادیوں نے بھی صدقہ حضور کا

اشجار بھی ہیں مدح گزارِ رسولِ پاک
ہے اسم پات پات پہ لکھا حضور کا

تخلیقِ باغِ دہر اُنھی کے سبب سے ہے
وجہِ نمودِ گل ہے پسینہ حضور کا

رحمت کے رنگ سیرتِ اطہر میں دیکھ کر
انساں ہُوا ہے چاہنے والا حضور کا

میرا قلم بھی کرتا ہے اُن ہی کا تذکرہ
ہے میرا حرف حرف ثناسا حضور کا

یادِ رسولِ پاک سے پا کر میں روشنی
لکھنے لگا ہوں آج قصیدہ حضور کا

یہ زندگی اُنھی کے سبب سے ہے کامراں
جو کچھ ہے میرے پاس، ہے صدقہ حضور کا

ایسا مقام پا نہ سکا دہر میں کوئی
جو ہے مقام ارفع و اعلیٰ حضور کا

مخلوق ہی نہیں ہے فقط اُن کی مدح خواں
خلاق بھی ہے چاہنے والا حضور کا

دولخت اِک اشارے سے مہتاب ہوگیا
یہ معجزہ تھا سب سے نرالا حضور کا

ہر آن مجھ کو شمعِ رسالت سے پیار ہے
ہو گا مری لحد میں اُجالا حضور کا

رضوان خود بُلائے گا مجھ کو بہشت میں
ہو گا سند یہ نعت مقالہ حضور کا

منکر نکیر مجھ سے کریں گے نہ سخت بات
اُن کو کروں گا پیش شمارہ حضور کا

شاعر علی شاعر

قسمت پہ اُن کو ناز، مقدر پہ فخر ہے
جس کو بھی آ گیا ہے بُلاوا حضور کا

ہر بوجھ زندگی کا سبک اُس پہ ہو گیا
جس نے بھی بارِ عشق اُٹھایا حضور کا

تاریخ میں وہ زندۂ جاوید ہو گیا
جس شخص نے بھی ساتھ نبھایا حضور کا

اُس دل میں نخلِ حُبِّ زمانہ کی جا نہیں
جس دل میں بس گیا ہو سراپا حضور کا

جو روشنی کا، خیر کا مرکز ہے دہر میں
روضہ حضور کا ہے وہ روضہ حضور کا

لوگو ہماری آنکھ میں جچتا نہیں کوئی
جب سے بسا ہے آنکھ میں چہرہ حضور کا

سایہ کسی کو کیسے نظر آتا آپ کا
جب نور سے بنا تھا سراپا حضور کا

یہ راستہ ہے خیر و محبت کا راستہ
انسان کی نجات ہے جادہ حضور کا

لگتا تھا جیسے کوئی چمن زار عطر ہے
ایسا تھا عطر بیز لبادہ حضور کا

یوں چاند چودھویں کا بھی چمکا نہیں کبھی
جیسے چمکتا رہتا تھا چہرہ حضور کا

اُس کی نظر کی روشنی ہوتی نہیں ہے کم
جو دیکھتا ہے خواب میں جلوہ حضور کا

ہر غم زدہ کے درد کا درمان آپ ہیں
گرتا نہیں کبھی بھی سنبھالا حضور کا

بخشش ملے گی اُس کو، عطا ہو گی مغفرت
محشر میں جو بھی دے گا حوالہ حضور کا

ذاتِ رسولِ پاک کا آساں نہیں شعور
جز رب ہے کون جاننے والا حضور کا

محبوبِ کردگار کا رُتبہ تو دیکھیے
نبیوں میں مرتبہ ہُوا بالا حضور کا

محشر میں ہوں گے سب سے نُمایاں رسولِ پاک
ہو گا بلند پرچمِ اعلیٰ حضور کا

دنیا میں نعت گو کوئی حسّان سا نہیں
رشکِ سخن وری ہے حوالہ حضور کا

کردارِ مصطفیٰ ہے مساوات کا عمل
کالا بشر حضور کا، گورا حضور کا

ہوتے ہیں فیض یاب مسلمان آج بھی
جاری ہے آبشار سا دھارا حضور کا

طوفان اُس کی ناؤ کنارے پہ لے گئے
ڈوبا نہ پھر کبھی بھی اُبھارا حضور کا

اپنی مثال آپ تھا وہ حسنِ سادگی
اپنا لباس آپ ہی سینا حضور کا

طائف کے ساکنان رہے اِس سے بے خبر
عزت حضور کی ہے، زمانہ حضور کا

تھے اُن پہ آشکار سبھی زندگی کے راز
کشافِ حق تھا دیدۂ بینا حضور کا

دشمن پہ بھی نگاہِ محبت تھی آپ کی
تھا پیار، پیار، پیار طریقہ حضور کا

باطل کی تیرگی سے بہت دُور ہے وہ دل
وہ جس میں جاگزیں ہے اُجالا حضور کا

بخشا گیا ہے مجھ سا خطاکار حشر میں
کیا کام کر گیا ہے اشارہ حضور کا

عصیاں شعار دل میں مدینے کی رکھ لگن
قسمت سنوار دے گا بُلاوا حضور کا

ہم عاصیوں کے کام ہی آیا بہ روزِ حشر
رب سے دعا کو ہاتھ اُٹھانا حضور کا

مجھ کو قدم قدم پہ ملیں کامیابیاں
فرمان جب خُلوص سے مانا حضور کا

معراجِ مصطفیٰ تو ہے عرشِ بریں کی سیر
تسلیم دل بھی کرتا ہے جانا حضور کا

دُنیا جہالتوں کے اندھیروں میں غرق تھی
ہے باعثِ کرم یہاں آنا حضور کا

وہ رحمتِ عظیم کے قلعے میں آ گیا
اِک بار جس نے پڑھ لیا کلمہ حضور کا

بیمار، کیوں نہ ہو گا شفایاب دوستو
مرہم ہے دل کے زخم کو لہجہ حضور کا

کتنی بڑی مثال ہے خُلقِ رسول کی
دشمن بھی دل سے ہو گیا شیدا حضور کا

تعظیم سب سے بڑھ کے ملی دو جہان میں
قرآں میں لکھ دیا ہے ترانہ حضور کا

اُن ہی کے دم سے کوہ و بیاباں کی شان ہے
چلتا ہے لے کے نام بھی دریا حضور کا

جو انتخاب نعت کا چھاپا تھا در حیات
مر کے بھی کام آیا رسالہ حضور کا

رب کا کلام خاص ہے اُم الکتاب میں
اُم الکتاب کیا ہے؟ قصیدہ حضور کا

اِس پر عمل کرو گے تو پاؤ گے تم نجات
سچا ہے، معتبر ہے صحیفہ حضور کا

پہچانتے نہ رب کو خدا کی قسم اگر
ہوتا نہ درمیان وسیلہ حضور کا

میری بھی مشکلات میں آسانیاں ہُوئیں
جب جب پڑھا ہے میں نے وظیفہ حضور کا

شعبان معتبر ہُوا، رمضان کی طرح
رب نے بنایا اِس کو مہینہ حضور کا

بیٹھیں گے ہم بھی گنبدِ خضریٰ کی چھاؤں میں
لے جائے گا جو ہم کو سفینہ حضور کا

اللہ تک پہنچ گئے محبوبِ کردگار
ساتوں فلک بھی بن گئے زینہ حضور کا

تخلیقِ کائنات کے اسباب دیکھ لو
گلشن حضور کا ہے تو صحرا حضور کا

وہ رحمتِ تمام ہیں مخلوق کے لیے
ہے مثلِ سائبان دوشالہ حضور کا

رحمت کی اِک پھوار بھگوتی گئی مجھے
جب بھی سنانے بیٹھا ہوں قصہ حضور کا

انسان کو بنایا ہے انسان بالیقیں
احسان مانتے ہیں لہٰذا حضور کا

احسانِ مصطفیٰ ہے زمانے پہ دوستو
انگلی پکڑ کے چلنا، سکھانا حضور کا

جس کی مثال کوئی نہیں، بے مثال ہے
ہر گھر سے معتبر ہے گھرانہ حضور کا

دیکھو بہ روزِ حشر شفاعت کریں گے وہ
وعدوں میں سب سے سچا ہے وعدہ حضور کا

تعریف کر رہی ہے محمد کی ساری خلق
ہے نام سارے ناموں میں اچھا حضور کا

کرتے رہیں گے تا دمِ آخر اُنھی کا ذکر
ہے ذکر ہم کو جان سے پیارا حضور کا

وہ جس کو چاہتے ہیں اُسی کو ملے گا بس
ہے فنِ نعت گوئی عطیہ حضور کا

جو واقفِ حجاب ہو اور پاک باز ہو
کرتی ہے وہ نظر ہی نظارہ حضور کا

اصحاب تھے کہ جیسے ستارے خلوص کے
ہر شخص معتبر تھا چنیدہ حضور کا

ہم کو بچا رہا ہے تمازت سے ہر گھڑی
سایہ فگن ہے آج بھی سایہ حضور کا

دُنیا کے ہر گلاب کی خوش بو ہے کم سے کم
مہکا کچھ اِس طرح سے پسینہ حضور کا

حیران کر رہا تھا فرشتوں کو ہر نفس
افلاک پر خُدا سے وہ ملنا حضور کا

ہستی کے سب رموز عیاں ہم پہ ہو گئے
عقدہ کشا تھا رمز بتانا حضور کا

دنیا میں روشنی ہے، اُجالا ہے ہر طرف
آیا ہے کام دیپ جلانا حضور کا

رکھیں قدم قدم پہ مراتب کا سب خیال
پاتا نہیں ہے اوج، گرایا حضور کا

خوش بخت ہے جسے بھی زیارت ہُوئی نصیب
ہے رشکِ دید دیکھنے والا حضور کا

گرویدہ کر لیا تھا عدو کو بھی آن میں
میٹھا تھا قند و شہد سے لہجہ حضور کا

سادہ ہے ہر طریق، نُمایش کہیں نہیں
رستہ ہے دشتِ عشق میں سیدھا حضور کا

اصحابِ مصطفیٰ کی سی ملتی نہیں مثال
بھولے نہ کوئی قول شنیدہ حضور کا

بُڑھیا وہ جو حضور کو دیتی تھی کلفتیں
بھولا نہ اُس کو وصف حمیدہ حضور کا

اسرار، کائنات کے کُھلتے گئے سبھی
کافی تھا ایک راز بتانا حضور کا

جنت میں وہ نبی کے پڑوسی بنیں گے جو
دن رات لکھتے رہتے ہیں خمسہ حضور کا

دیکھا ہے بزمِ نعت میں محبوب کا جمال
نعتوں میں بھی ملے گا نظارہ حضور کا

تہذیب نظم وضبط کی دیتا ہے وہ مثال
دیکھا ہے جس نے ہونا صف آرا حضور کا

عشاقِ مصطفیٰ جنھیں کہتے ہیں اہلِ عشق
ہے اُن کے جان و دل پہ اجارہ حضور کا

ناچیز مجھ حقیر کو بخشا ہے جو کمال
اِس میں کرم ہے سارے کا سارا حضور کا

پروردگار نے ہمیں بخشا شعورِ نو
چھوڑی غزل تو لکھا قصیدہ حضور کا

مرنے کے بعد قبر میں سنتا ہے بالقیں
اِک ایک حرف و لفظ پکارا حضور کا

جو نور مانتے نہیں اُن کا فتور ہے
اِس میں نہیں ہے کچھ بھی خسارا حضور کا

دُنیا کے اِس چمن میں رہے گی سدا بہار
دُنیا کا یہ چمن ہے نکھارا حضور کا

اِک بار تھامو دامنِ آقا یہ سوچ کر
پھر ڈوبتا نہیں ہے ترایا حضور کا

اُس گلشنِ حیات میں آتی نہیں خزاں
ہو گلشنِ حیات سنوارا حضور کا

علم وشعور وآگہی اُس کا نصیب ہے
جس نے پیا ہو عشق پیالا حضور کا

دُنیا سجائی آپ کی تخلیق کے لیے
اللہ خود ہے انجمن آرا حضور کا

سردار بن گیا کوئی، سالار بن گیا
اپنی مثال آپ ہے پالا حضور کا

تھے غیب کے نظارے بھی اُن کی نگاہ میں
ایسا تھا تیز دیدۂ بینا حضور کا

کردار، مصطفیٰ کا عدو کو بھی تھا پسند
ہر لفظ ، ہر کلام تھا اُجلا حضور کا

دُنیا میں ایسا عبد کوئی دوسرا نہیں
اللہ کو پسند تھا سجدہ حضور کا

اسرا کی رات کیسے وہ راز و نیاز تھے
کُھلتا نہیں ہے آج بھی عُقدہ حضور کا

یہ رحمتوں کا شہر ہے اِس کی کہاں مثال
دُنیا میں سب سے خاص ہے طیبہ حضور کا

ملنا تھی اُس کو منزل مقصود لازمی
قدموں میں آ گرا جو تپیدہ حضور کا

لوگو تمام شہروں سے بڑھ کر ہے پُر جمال
نایاب و قیمتی ہے مدینہ حضور کا

خاتم ہیں آپ، اب نہ نبی کوئی آئے گا
اب آخری چراغ ہے قصہ حضور کا

دُنیا کے باغ اور بھی سرسبز ہو گئے
گلشن بنا ہے پیڑ لگانا حضور کا

عشقِ خُدا کے نور سے دل تھا بھرا ہُوا
روح الامیں نے چیرا جو سینہ حضور کا

نورانیت کی شکل میں رب نے دیا اُنھیں
رکھا تھا اپنے پاس جو حصہ حضور کا

ملتی ہے جس سے ہم کو ہدایت کی روشنی
قولِ نبی میں ہے وہ قرینہ حضور کا

انسانیت کا کرنے لگا احترام خوب
دل میرا جب سے ہو گیا شیدا حضور کا

دیکھے گا جو بھی گنبدِ خضریٰ کی رونقیں
مانے گا رب اُسے بھی شناسا حضور کا

حاوی نہ ہم پہ ہوتے کبھی غیر اِس قدر
جو یاد رکھتے قول شنیدہ حضور کا

آئے گا جب بھی رحمتِ عالم کا تذکرہ
ہم گفتگو میں دیں گے حوالہ حضور کا

ہر ہر ادا سے آپ کی، توحید تھی عیاں
وحدانیت کی سمت تھا شملہ حضور کا

فرقِ بشر کا تاج ہیں پیارے رسولِ پاک
نبیوں میں بھی مقام ہے ارفع حضور کا

محشر میں مجھ کو دیکھ کے کہنے لگے سبھی
دیکھو وہ آ گیا ہے دِوانہ حضور کا

دل سے لگا کے رکھنا نشانی یہ آخری
قرآن و اہل بیت ہیں تحفہ حضور کا

پروردگار ہوتا نہیں مجھ سے انتظار
اب خواب میں دِکھا رخِ زیبا حضور کا

ارماں ہے، آرزو ہے، یہی دل کا مدعا
اے کاش میں بھی دیکھ لوں روضہ حضور کا

دل باغ باغ ہوتا ہے محفل میں نعت کی
سنتا ہوں ہر زباں سے جو نغمہ حضور کا

اُن کا خیال رہتا ہے راتوں کو نیند میں
میں دیکھتا ہوں دن میں بھی سپنا حضور کا

مجھ کو کہو نہ مفلس و نادار دوستو
مجھ کو ملا حدیث اثاثہ حضور کا

مجھ جیسے بدنصیب کی ہو جائے گی نجات
میرے لیے اگر ہو اشارہ حضور کا

مجھ کو عطا ہو دولتِ دیدارِ مصطفیٰ
پروردگار میں تو ہوں شیدا حضور کا

خوش بخت و خوش نصیب ہے شاعر، تو اِس میں دخل
قسمت کا کم سے کم ہے، زیادہ حضور کا

☆☆☆☆☆

منقبت درشانِ فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا

[مادرِ آلِ محمدؐ، دخترِ خیرالانام مرحبا صلِ علیٰ خاتونِ جنت السلام]

سیّدہ ، خیرالنساء ، اُم الائمہ کرام
مادرِ آلِ محمدؐ، دُخترِ خیرُالانام
رشکِ مریم، زوجۂ مولا علی، ذی احتشام
جملہ مستورات کی سردار ومخدومہ سلام

السّلام اے نورِ عینِ سرورِ کون و مکاں
بیٹے سردارانِ جنت، باپ فخرِ دوجہاں
قافلہ سالارِ عظمت آپ خاتونِ جناں
عرش کو ہے ناز جس پر آپ کا ہے آستاں

فاطمہ زہرا ہیں بے شک شکلِ انسانی میں حور
رحمۃ للعالمیں کی آپ ہیں آنکھوں کا نور
جس سے یہ راضی ہوں، اُس سے راضی ہو رب غفور
میری جاں ہیں آپ، فرماتے تھے یہ میرے حضور

مرحبا، صلِ علیٰ کہ آپ ہیں بنتِ رسول
مادرِ آلِ نبی ، گلدستۂ عصمت کا پھول
فاطمہ زہرا ہیں ذکیہ، راضیہ، عذرا، بتول
حشر میں ہوگی شفاعت آپ کی بے شک قبول

عالمِ اسلام کی خاتونِ اوّل کا وقار
فخرِ حوّا، رشکِ مریم ، آسیہ کا افتخار
مظہرِ شانِ نبی رحمتِ پروردگار
دستِ قُدرت کا یقیناً آپ ہیں اِک شاہکار

دیکھو جبریلِ امیں ہیں آپ کے در کے گدا
آئے ہیں بن کر بھکاری، وقت ہے افطار کا
دیدیا سب کچھ اُنہیں، جو کچھ بھی افطاری میں تھا
گھونٹ سے پانی کے روزہ تیسرا بھی کُھل گیا

عالمہ بھی ،عابدہ بھی ،طاہرہ بھی فاطمہ
سورۂ کوثر کی ہیں تشریح بے شک فاتحہ
مالکہ، ملکہ ، صبیحہ ، صادقہ اور صالحہ
آپ ہیں والعصر معنیٰ حروفِ ھَل اَتیٰ

باپ صادق اور امیں، بیٹی امینہ، صادقہ
آپ کے کیا کہنے صدیقہ، حلیمہ، آمنہ
مریمِ کبریٰ بھی تھیں مستور و مخفی آپ میں
صورت و سیرت میں ہے جلوہ رسولِ پاک کا

سید عارف معین بلے

راکعہ بھی، ساجدہ بھی، عابدہ بھی فاطمہ
عالمہ ہیں، فاضلہ ہیں، صالحہ بھی فاطمہ
ذاکرہ بھی، شافعہ بھی، دانیہ بھی فاطمہ
عظمت و رفعت میں مروی و صفا بھی فاطمہ

مخزنِ فخر و توکل، معدنِ عظمت سلام
منبعِ جود و کرم، اے سربسر رحمت سلام
السلام اے پنجتن کی شان اور شوکت سلام
محورِ اہلِ کسا، سادات کی عزت سلام

اہلِ بیتِ پاک کا بھی مرکز و محور ہیں آپ
نازشِ کونین بھی ہیں، فخرِ پیغمبر ہیں آپ
ہمسرِ مولودِ کعبہ، ہمدمِ حیدر ہیں آپ
دین و دنیا کے جمال و حسن کا مظہر ہیں آپ

آپ کی ہر دو ہتھیلی پر مشقت کے ہیں پھول
سورۂ کوثر کی بے شک آپ ہیں شانِ نزول
ہیں طہارت یاب یوں دنیا میں کہلائیں بتول
آیہ تطہیر کا عنوان ہیں بنتِ رسول

باعثِ رحمت ---- برائے رحمۃ للعالمیں
آپ صادق اور امیں کے بھی خصائل کی امیں
آپ کے تو در کے بھی دربان ہیں روح الامیں
آپ سا کوئی نہیں ہے، کوئی ہو سکتا نہیں

شاہزادی شاہِ دوعالم کی، یکتا ہر ادا
آپ کی پوشاک میں بھی کام ہے پیوند کا
فقر و فاقے میں بھی یہ دیکھی گئی شانِ سخا
کوئی خالی ہاتھ اس در سے نہیں لوٹا گدا

احمد مرسلؐ بجالاتے تھے ان کا احترام
ان کی آمد پر کھڑے ہو کر وہ کرتے تھے سلام
مرحبا! یہ شان، یہ عزت، یہ عظمت، یہ مقام
مرتبت ایسی ہے کس کی؟ ہے کوئی کیا اور نام

اپنی پلکیں ان کے رستے میں بچھا دیتے تھے آپ
یوں بھی عظمت ان کی دنیا کو دکھا دیتے تھے آپ
ان کی خاطر فرش پر کملی سجا دیتے تھے آپ
خود کھڑے ہو کے انہیں اس پر بٹھا دیتے تھے آپ

ہے کوئی ہستی جسے یہ شان، یہ عزت ملی؟
فرش پر رہتے ہوئے بھی عرش کی رفعت ملی
ان کو دربارِ رسالتؐ میں بھی افضلیت ملی
آپ کو ورثے میں بھی قرآں ملا، حکمت ملی

ناز ہے تقوے کو جس پر آپ کی ہے زندگی
رشکِ پیغمبر کریں ایسی ہے عصمت آپ کی
ہاں! لقب اُمِّ ابیہا کا بتاتا ہے یہی!
ہیں نبیؐ سے آپ بے شک، آپ ہی سے ہیں نبی

باپ سے بیٹی کا ہونا تو سمجھ آتا ہے پر
باپ کا بیٹی سے ہونا عقل سے ہے بالاتر
پھول، پھل، چھاؤں کا منبع کون؟ کہنا سوچ کر
درحقیقت آپ ہیں باغِ رسالت کا شجر

یوں ملا ہے آپ کو اُم ابیھا کا خطاب
آپ سے بے شک نبوت اور رسالت فیضیاب
سورۂ کوثر ہے دشمن کے سوالوں کا جواب
آپ سے نسلِ محمدؐ کی بقا، عصمت مآب

بخت یوں بھی اپنے بچوں کا جگا دیتی ہیں آپ
لوریاں قرآن کی دے کر سُلا دیتی ہیں آپ
رات کے پچھلے پہر اُن کو اُٹھا دیتی ہیں آپ
رحمتیں کیسے اترتی ہیں، دِکھا دیتی ہیں آپ

آپ ہی کے گھر میں ہے ختمِ رسالت مرحبا
آپ کے گھر کا تفاخر ہے امامت، مرحبا
شان کے شایان ہے بے شک ولایت مرحبا
آپ ہیں سرچشمہء رُشد و ہدایت مرحبا

آپ ہیں آنکھوں کی ٹھنڈک سرورِ کونین کی
آپ کے قدموں تلے جنت بھی ہے حسنین کی
روشنی باقی --- ہے برکت آپ کے قدمین کی
ہیں نچھاور آپ پر سب رحمتیں دارین کی

صحنِ بزمِ دوجہاں میں چاندنی زہرا کی ہے
آج عورت کا تقدس، روشنی زہرا کی ہے
جو ردا تارِ مقدس سے بنی زہرا کی ہے
ہے بدن پر جو حرم کے اوڑھنی زہرا کی ہے

سیّدہ کی چادرِ تطہیر کو میرا سلام
ان کی مدحت میں ہر اک تحریر کو میرا سلام
شان میں زہرا کی ہر تسطیر کو میرا سلام
آیہء تطہیر کی تفسیر کو میرا سلام

دولتِ دُنیا و دیں ہے آپ کے دامان میں
ہے عقیدت آپ کی شامل مرے ایمان میں
سوچئے، اَب کیا کہوں میں فاطمہ کی شان میں
آپ کی لکھی ہوئی ہے منقبت قرآن میں

رات دن تسبیح ہے، تحمید ہے، تکبیر ہے
فاطمی تسبیح ہے کیا؟ نسخہء اکسیر ہے
یہ وظیفہ ایسا ہے، جس میں بڑی تاثیر ہے
ذکر سے دُکھ دور کرنا آپ کی تدبیر ہے

تولنا ممکن کہاں ہے؟ رحمتِ پروردگار
آپ کے بے شک محاسن کا نہیں کوئی شمار
مجھ پہ ہو جائے کرم کی اک نظر ہے انتظار
ہوں تہی داماں مگر بس آپ پر ہے اعتبار

☆☆☆☆☆

عقیدت

اُن کی چوکھٹ پہ سر جھکانے سے
ہو گئے معتبر زمانے سے

روز کھاتے ہیں ہم من و سلویٰ
کملی والے کے توشہ خانے سے

ہونٹ ہونٹوں کو چوم لیتے ہیں
نام اُن کا زباں پہ لانے سے

خوشبوئیں ذہن میں مچلتی ہیں
نعتیہ شعر گنگنانے سے

کوئی ادنیٰ ہو یا کہ اعلیٰ ہو
سارے کمتر ہیں اس گھرانے سے

ان کی نظر کرم ہوئی ورنہ
رنگ جمتا نہیں جمانے سے

کوئی خالی نہیں گیا شاہد
سبز گنبد کے آستانے سے

افتخار شاہد

عقیدت

نعرۂ صل علی ہے وہ ندائے زریں
جو بنا دیتا ہے قسمت کو قضائے زریں

آرزو ہے ورفعنا لك ذكرك کے طفیل
کرے ہر دل کو منور یہ ضیائے زریں

نامِ احمدؐ سے مزین کروں باتیں جو بھی
میرے اقوال کو اللہ بنائے زریں

نقش کر جامۂ ہستی پہ بھی یوں عشق اُن کا
جیسے کعبے کے غلافوں پہ ولائے زریں

پڑھ درود ان کی قناعت پہ توکل پہ جہاں
ہے فدا فقر پہ ہر فخرِ غنائے زریں

کاسۂ اشک لئے مانگوں زرِ صل علی
اِس سے پھر بڑھ کے نہیں کوئی دعائے زریں

یوں بھٹک جاؤں میں طیبہ میں نہ خود کو بھی ملوں
کاش سرزد ہو کسی دن یہ خطائے زریں

تیرے کعبے میں بھی یزداں! نہیں ایسے منظر
جیسے طیبہ ہے تقدس کی فضائے زریں

جہاں آواز گوارا نہیں اونچی ان سے
میرے اشکوں کی خموشی ہے صدائے زریں

دیں طہارت ہے مگر تزکیۂ علم و عمل
جو محمدؐ نے کیا وہ ہے زکائے زریں

جس کی ہے بعثتِ عظمیٰ زرِ اکملت لکم
اُس کا پرچم ہی ابد تک ہے لوائے زریں

رب سے خود کہہ دیں وہ محشر میں: ہے آصف میرا
پھر تو مانگوں نہ کوئی اور جزائے زریں

مرزا آصف رسول

رباعیات

دنیا کیا ہے فریبِ دنیا کیا ہے
چلتا ہوا وقت کا یہ دریا کیا ہے
ہر لمحہ فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے
حیران ہوں، رات دن یہ قصہ کیا ہے

.....

یہ عمر فنا کا آئنہ ہے کیا ہے
یہ سانس بھی موت کی صدا ہے کیا ہے
دل کی دھڑکن یہ کر رہی ہے تکرار
جینا یہی جینا ہے تو کیا ہے کیا ہے

.....

غرقِ بحرِ فنا روانی کیا ہے
چڑھتے دریاؤں کا پانی کیا ہے
سودائے عشق بھی ہے مانندِ حباب
دو چار سے کی یہ جوانی کیا ہے

.....

خوشبو ہے رنگ ہے صدا ہے، کیا ہے
قطرہ ہے موجۂ ہوا ہے، کیا ہے
کرچی کرچی بکھر رہا ہے خالد
دل ایک شکستِ آئنہ ہے، کیا ہے

.....

ہر سانس پہ موت کا گماں رہتا ہے
اک شور قریبِ رگِ جاں رہتا ہے
کھل جائے جو بھید زندگی کا خالد
جینے کا احساس کہاں رہتا ہے

.....

رہتے ہیں زندگی سے آزردہ ہم
ہیں موت کے ذکر سے بھی افسردہ ہم
اک شاخِ گلاب ہیں، ہمارا کیا ہے
اک پل زندہ تو ایک پل مردہ ہم

.....

ہر شے کا وجود رازِ پنہانی ہے
تفہیمِ شعور کیا ہے، نادانی ہے
ہے اصل کے پاس عکس کی عریانی
آئینے کے پاس صرف حیرانی ہے

خالد علیم

اختر حسین جعفری: ایک جدید شاعر اور ترقی پسند دانشور

اختر حسین جعفری نہ صرف ایک جدید شاعر تھے بلکہ ایک ترقی پسند دانشور بھی تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص فلسفہ حیات اور طرزِ اظہار سے اردو شاعری کو فن کی نئی بلندیوں سے روشناس کروایا۔ انھوں نے مشرق کی قدیم اور کلاسیکی شاعری اور مغرب کی عصری اور جدید شاعری کے درمیان ایک ادبی پل تعمیر کیا۔ ان کا تعلق بیسویں صدی کی ان شخصیات کے قبیلے سے ہے جن میں ایزرا پاؤنڈ 'اوکٹاویو پاز' ناظم حکمت اور پابلو نرودا جیسے معتبر' معزز اور محترم شاعر اور دانشور شامل ہیں۔

مجھے اپنی نوجوانی کا وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب 1980 کی دہائی میں اختر حسین جعفری سے پاک ٹی ہاؤس لاہور میں میری مختصر سی ملاقات ہوئی۔ ان کی شخصیت اتنی بارعب تھی کہ میں نے چند منٹوں کی ملاقات کے بعد اجازت چاہی اور دل میں چھپی خواہش ہونے کے باوجود میں ان کا انٹرویو نہ لے سکا۔ میں ادبی تشنگی لیے گھر لوٹ آیا۔ اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ برسوں بلکہ دہائیوں بعد وہ خوش بخت دن بھی آئے گا جب میری دیرینہ ادبی پیاس بجھے گی اور میں ان کے بیٹے امیر حسین جعفری کا 2013 میں ٹورانٹو میں

خالد سہیل

انٹرویولوں گا اور ان سے ان کے والد کے بارے میں تفصیلی تبادلہ خیال کروں گا۔

امیر حسین جعفری کے مکالے سے مجھے اس کلید کا سراغ ملا جس نے اختر حسین جعفری کی شاعری کے کئی خفیہ اور پُراسرار قفل کھولنے میں میری مدد کی۔ عین ممکن ہے یہ مضمون اختر حسین جعفری کے سنجیدہ قاریوں 'مداحوں اور نقادوں کی ادبی' تحقیقی و تخلیقی مدد کر سکے اور وہ اختر حسین جعفری کی شخصیت اور شاعری کے ان رازوں سے آشنا ہو سکیں جو اس سے پہلے ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔

سیاست: احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں 'اختر حسین جعفری اپنی روشن خیالی اور انسان دوستی کے حوالے سے آمریت' فسطائیت اور مطلق العنانیت کا غیر مشروط دشمن ہے۔ اسے انسان کی فکر و نظر کی مکمل آزادی بے حد عزیز ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس نے خود کو اپنے اہل وطن کی ذہنیتوں کی تہذیب پر مقرر کر رکھا ہے۔'

1985 کی ادیبوں کی کانفرنس میں جب جنرل ضیا الحق نے اپنی تقریر میں اختر حسین جعفری کا نام لیے بغیر ان کی مقبول نظمیں پڑھ کر شاعروں 'ادیبوں اور دانشوروں کو ڈرایا اور دھمکایا تو سب حاضرین محفل نے گردن گھما کر اختر حسین جعفری کی طرف دیکھا کیونکہ وہ بھی اس محفل میں شریک تھے۔

احمد ندیم قاسمی فرماتے ہیں 'جنرل صاحب نے اس طرح یہ ثابت کرنا چاہا کہ اس نوعیت کی شاعری کرنے والے لوگ وطن دشمن ہیں۔' ضیا الحق نے کہا:

'تیسرا دھارا ان تخلیق کاروں کی تحریروں پر مبنی ہے جنھیں اسلام اور پاکستان دونوں سے چڑ ہے۔ وہ اسی ملک کا کھاتے ہیں اور اسی کی ہوا میں سانس لیتے ہیں لیکن ان کا قبلہ کہیں اور ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن ان کے پھیلائے ہوئے زہر کی تاثیر بھی بہت تیز ہے۔'

جب میں نے امیر حسین جعفری سے اس افسوسناک اور تکلیف دہ واقعہ کی تفاصیل پوچھیں تو انھوں نے فرمایا کہ جب پاکستان کے جمہوریت پسند وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ضیا کی حکومت نے 1979 میں سولی پر چڑھا دیا تو پاکستان کے حریت 'امن اور ترقی پسند شعرا نے' جن میں احمد فراز 'احمد ندیم قاسمی' فیض احمد فیض اور اختر حسین جعفری شامل تھے 'احتجاجی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ اسی لیے ضیا الحق کو وہ شاعر اور ان کی شاعری ایک آنکھ نہ بھائے اور اس نے ان کو خاموش کرنے کی پوری کوشش کی۔

امیر اور ان کے بڑے بھائی منظر اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اختر حسین جعفری نے کانفرنس سے اپنے بیٹے منظر کو فون کیا اور مشورہ دیا کہ وہ ان کے کپڑے اور کتابیں ایک سوٹ کیس میں ڈال دے تاکہ اگر انھیں جیل جانا پڑے تو وہ اس کے لیے تیار ہوں۔ ان سنگین حالات میں اختر حسین

جعفری کا خاندان بہت گھبرایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ادیب، شاعر اور دانشور جو حکومت کی حراست میں چلے جاتے ہیں وہ یا تو پس دیوار زندان بھیج دیئے جاتے ہیں اور یا سولی پر چڑھا دیئے جاتے ہیں۔

ضیا الحق نے اپنے دور حکومت میں شدت اور تشدد پسندی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی اور ملک میں ایک خوف کی فضا قائم کی تھی لیکن ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی اختر حسین جعفری بالکل بددل نہ ہوئے اور وہ اپنی باغیانہ نظمیں رقم کرتے رہے کیونکہ وہ ایک جدید شاعر ہی نہیں ایک ترقی پسند دانشور بھی تھے۔ ایسے ہی پس منظر میں انہوں نے لکھا تھا:

میں اور سزائے سطر معصوم
دامن داغوں سے بھر گیا ہے
رسی کا سرا ہے ہات میرے
رسی سے گلا مرا بندھا ہے

اور

برگد کی زنبیل کے قیدی سورج کب واپس ملتے ہیں
برگد کی زنبیل کہ جس میں شام و سحر کا پس خوردہ ہے
انجم شب بیدار کا سر ہے

.....

جب میں نے امیر حسین جعفری سے ان کے والد کا ترقی پسند فکر سے رشتے کے بارے میں پوچھا تو وہ فرمانے لگے کہ اختر حسین جعفری طالب علمی کے زمانے میں ہی اس تحریک کے خوابوں اور آدرشوں سے جڑ گئے تھے۔ جس دور میں کمیونسٹ پارٹی کو پاکستان میں بین کیا گیا تھا اور ترقی پسند دانشور سجاد ظہیر پر عرصہ حیات تنگ کیا گیا تھا اور ان پر بہت سے سماجی و سیاسی دروازے بند کیے گئے تھے اس دور میں اختر حسین جعفری نے اپنے کامریڈ دوست کے لیے اپنے دل اور گھر کے دروازے کھول دیئے تھے۔ اسی لیے اختر حسین جعفری بھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اختر حسین جعفری کو بھی طویل عرصے تک قید و بند کی زندگی گزارنی پڑتی اگر ان کے والد حکومت کے اعلیٰ افسر نہ ہوتے اور ان کے اصحاب بست و کشاد سے اچھے تعلقات نہ ہوتے۔

امیر حسین جعفری نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کی والدہ محترمہ کنیز صغریٰ (ان کا چند روز پیشتر انتقال ہوا ہے) بھی سیاسی شعور کی مالک ایک فعال سیاسی کارکن ہیں۔ وہ اختر حسین جعفری کی ہم خیال اور ہمراز اور امن اور انصاف کے سفر میں ان کی ہم رکاب تھیں۔ وہ بھی سیاسی امن اور معاشی انصاف کے خوابوں اور آدرشوں کی دلدادہ تھیں۔ اسی لیے اختر حسین جعفری نے اپنا مجموعہ کلام۔ جہاں دریا اترتا ہے۔ ان کے نام انتساب کیا تھا۔ انھوں نے اپنی شریک حیات 'اپنی شریک سفر اور اپنے بچوں کی ماں کی خدمت میں جس نظم کا تحفہ پیش کیا تھا وہ حاضر خدمت ہے:

محبت

تھا اسے پیار میرے بچوں سے

اور مری آرزو میں دفن ہوئی
میں کہ زندہ تھا صرف اس کے لیے
اب بھی زندہ ہوں اور وہ بچے
سوئی جاگی اداس آنکھوں سے
گھر کے ویران صحن میں، میرا
رات بھر انتظار کرتے ہیں
دور آنگن میں کھل رہا ہے کہیں
'شاخ تاریک پر سرخ گلاب'

شاعری: احمد ندیم قاسمی اختر حسین جعفری کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

'تب ایک روز ایک عجیب حادثہ ہوا۔ جعفری صاحب گوجرانوالہ سے لاہور تشریف لائے اور 'فنون' کی اس ہفت روزہ محفل میں شریک ہوئے۔ 'فنون' کا تازہ شمارہ بیشتر اہل محفل کے ہاتھوں میں تھا۔ یکا یک سید علی عباس صاحب نے جعفری صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا' جعفری صاحب! آپ جو شاعری کر رہے ہیں وہ کس کے لیے کر رہے ہیں؟ میں اپنے آپ کو ایک پڑھا لکھا فرد سمجھتا ہوں اور فلسفے کے علاوہ میں نے اردو' فارسی' انگریزی وغیرہ کی شاعری کا مطالعہ بھی بالاستیعاب کیا ہے مگر آپ کی کوئی نظم میرے پلے نہیں پڑتی۔ اگر آپ نہ عوام کے لیے لکھتے ہیں نہ پڑھے لکھے طبقے کے لیے تو پھر کس کے لیے لکھتے ہیں؟ آپ کی آڈینس کون سی ہے؟

بھری محفل میں جعفری صاحب کے ساتھ سید صاحب کی یہ گفتگو میرے علاوہ تمام حاضرین کے لیے حیرت انگیز تھی مگر جعفری صاحب کا چہرہ بتا رہا تھا کہ سید صاحب کا یہ استدلال ان کے لیے صرف حیرت انگیز ہی نہیں دردانگیز بھی تھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ محفل برخاست ہوئی تو واپس گوجرانوالہ چلے گئے۔ دوسرے روز تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں ایک غزل نما نظم تھی۔ اس میں سید صاحب کی تنقید کا ایسا بھرپور جواب شامل تھا کہ میں اور میرے علاوہ حاضرین۔ دیر تک یہ اشعار پڑھتے رہے اور جھومتے رہے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

نہ فکر سدرہ نشین میری، نہ رفعت آسمان میری
نہال غم پر مرا بسیرا، ہرے شجر پر اڑان میری
صدا کے رستے پہ شہر مفہوم دور سے دور تر لگا ہے
مرا ہر اک لفظ پا بریدہ، خلل گرفتہ زبان میری
کہیں تو معدومیوں کی شمعوں میں نیم روشن تھا نام میرا
کہیں پہ بے حرف لوح تنزیل تھی شب نکتہ دان میری
بس ایک آنسو کے دخل نے منظر وفا کو بدل دیا تھا
بس ایک موج خفی کے آگے حس رواں تھی چٹان میری
یہ آتشیں تیر کس مکاں سے شب مناجات آ لگا ہے
دھواں دھواں ہے کتاب میری لہولہو ہے زبان میری

.....

میں نے جب امیر حسین جعفری سے پوچھا کہ ان کی نگاہ میں اردو کے قاریوں' شاعروں اور نقادوں کو ان کے والد کی شاعری کی تفہیم میں کیوں اس قدر دشواریاں اور ابلاغ میں اس قدر مشکلات پیش آتی ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ اس کی

ایک وجہ یہ ہے کہ اختر حسین جعفری تخلیقی اور فنی حوالے سے انگریزی کی جدید شاعری کی روایت سے جڑے ہوئے تھے اور ایزرا پاؤنڈ کو بہت پسند کرتے تھے۔ اسی لیے اردو کے وہ قارئین جو انگریزی ادب کی جدید روایت سے ناآشنا ہیں انھیں اختر حسین جعفری کی شاعری کی تفہیم میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ اختر حسین جعفری ایزرا پاؤنڈ کو اتنا عزیز رکھتے تھے کہ جب انہیں ایذرا پاؤنڈ کی موت کی خبر ملی تو انہوں نے بے ساختہ مندرجہ ذیل نظم لکھی:

ایذرا پاؤنڈ کی موت پر
تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
انتظار بہار بھی کرتے
دامن چاک سے اگر اپنے
کوئی پیمان پھول کا ہوتا
آ تجھے تیرے سبز لفظوں میں
دفن کر دیں کہ تیرے فن جیسی
دہر میں کوئی نو بہار نہیں

.....

امیر حسین جعفری سے گفتگو کے بعد جب میں نے اختر حسین جعفری کی شاعری کی بہتر تفہیم کی کوشش میں انگریزی ادب کی جدید شاعری کی روایت اور ایذرا پاؤنڈ کے ادبی خیالات کا مطالعہ شروع کیا تو میرا تعارف ایسے فنی نظریات سے ہوا جن سے میں پہلے ناواقف تھا۔ وہ خیالات و نظریات وہ کنجی ثابت ہوئے جس نے اختر حسین جعفری کی شاعری کا قفل ایسا کھولا کہ مجھ پر ان کی نظموں کے راز ہائے سربستہ منکشف ہونے شروع ہو گئے۔

ایزرا پاؤنڈ کے مقالوں نے میرا تعارف انگریزی ادب کی جدید شاعری کی روایت کی ان اصطلاحات اور نظریات سے کروایا جو

امیجزم imagism
ورٹیکس vortex اور
ورٹسزم vorticism

کے ناموں جانے جاتے ہیں۔ یہ خیالات اور نظریات چونکہ جدید شاعری کی طرح قدرے دشوار، گنجلک اور پیچیدہ ہیں اس لیے میں انہیں عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

1914 میں ایذرا پاؤنڈ نے جدید شاعری کی تفہیم کے حوالے سے ایک سنجیدہ مقالہ رقم کیا جس کا عنوان۔ ورٹیکس vortex تھا۔ اس مقالے کو وِنڈہیم لوئس Wyndham Lewis نے اپنے میگزین Blast میں شائع کیا۔ اس مقالے میں ایذرا پاؤنڈ فرماتے ہیں

ورٹیکس اور گرداب وہ مقام ہے جہاں توانائی اپنی معراج پر پہنچتی ہے۔

وہ ورٹسسٹ شاعر جو اپنی شاعری میں ورٹیکس کو اپنے فن کی بنیاد بناتا ہے وہ اپنے شاعری کی تصویر میں اس رنگ کو نمایاں رکھتا ہے۔

ایسے شاعر کے ذہن میں ہر خیال اور ہر جذبہ ایک تصویر بناتا ہے جسے وہ اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر الفاظ سے وہ تصویر کاغذ پر تحریر کرتا ہے۔ اس حوالے سے اس کا قلم اس کا داخلی کیمرہ بن جاتا ہے۔

ایسے جدید شاعر کے لفظوں اور شعروں کی ہر تحریر اور ہر تصویر پوری کہانی پوری حکایت اور پوری کہاوت سناتی ہے۔ اس کی نظموں میں الفاظ تصویریں بناتے چلے جاتے ہیں اور وہ تصویریں دل کے تاروں کو چھیڑتی چلی جاتی ہیں۔

شاعر کے تجربے اور اس کے مشاہدے میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک جولانی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اس کے من میں الفاظ رقص کرنے لگتے ہیں ان میں طغیانی آتی ہے اور وہ بڑھتے بڑھتے ایک گرداب میں ایک وورٹکس میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اس کے ماضی کے سارے تجربات اور مشاہدات اس کے حال میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس پر ایک کیف و سرور اور ایک ٹرانس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس وارفتگی کی کیفیت میں شاعر کی داخلی آنکھ کو ایک تصویر دکھائی دینے لگتی ہے اور شاعر اس تصویر کو کاغذ پر تحریر کرتا ہے۔

اس طرح اس شاعر کے الفاظ ماضی اور مستقبل، دیروز اور فردا کے درمیان ایک پل تعمیر کرتے ہیں۔ ایسے پل جو ظاہر کی آنکھ سے نہیں صرف باطن کی آنکھ سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے جدید شاعری قاری سے تیسری آنکھ کے کھلنے کی متقاضی ہوتی ہے۔ اور اگر اندر کی آنکھ کھلی نہ ہو تو قاری کو کچھ دکھائی نہیں دیتا کچھ سجھائی نہیں دیتا اسے چاروں طرف دھند ہی دھند دکھائی دیتی ہے اسی لیے وہ قاری جدید شاعر کی تحریر و تصویر کو مبہم اور مشکل تصور کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے معزز و معتبر نقاد ٹی ایس ایلیٹ TS ELIOT نے اپنی مشہور کتاب LITERAY ESSAYS میں لکھا ہے کہ انگریزی ادب میں تمام جدید شاعروں میں سے ایذرا پاؤنڈ کی شاعری نے سب سے زیادہ انقلاب برپا کیا ہے۔

ایذرا پاؤنڈ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے جس قبیلے کے ممبر تھے اس میں جیمز جائس، ٹی ایس ایلیٹ اور رابرٹ فراسٹ بھی شامل تھے۔

ایذرا پاؤنڈ کی جدید شاعری پر اتنے اعتراضات ہوئے کہ وہ بیسویں صدی کے سب سے زیادہ متنازعہ فیہ شاعر بن گئے۔ کچھ ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور کچھ اسی شدت سے نفرت کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے فنکار ہیں جن کی شاعری جہاں کچھ قاریوں کو حیران کرتی ہے تو کچھ ناقدوں کو پریشان بھی کرتی ہے کیونکہ وہ قاری اور نقاد سے کچھ ایسا مطالبہ کرتی ہے جو روایتی شاعری نہیں کرتی۔

ایزرا پاؤنڈ کے جدید شاعری کے بارے میں خیالات و نظریات ہمیں اختر حسین جعفری کی شاعری سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ جدید شاعری کی تفہیم کے لیے جس طرح گرداب اور وورٹیکس کے تصور کو سمجھنا ضروری ہے اسی طرح خیالات اور تصورات کے باہمی رشتے کو جاننا بھی ضروری ہے۔ اسی رشتے کو امیر حسین جعفری نے اپنی ایک نظم میں بڑی فنی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

جناب اختر حسین جعفری کی پوئیٹک تھیوری پر ایک نظم:

نظم کب ہے یہ ایک ساعت ہے
ایک ساعت کہ جس کے باطن میں
اگنت بے شمار منظر ہیں
دیکھتا ہوں کہ شب کے پردے پر
اک ستارا سا جھلملاتا ہے
روشنی کے اسی توقف میں
مجھ پہ گزرے ہوئے زمانوں کی
ایک تصویر سی ابھرتی ہے
میں زمان و مکاں کے ملبے سے
کچھ شکستہ حروف چنتا ہوں
خامشی کے سفید کاغذ پر
اپنی تاریخ درج کرتا ہوں
نظم کب ہے یہ ایک ساعت ہے
ایک ساعت کہ جس کے باطن میں
اگنت بے شمار منظر ہیں

.....

امیر حسین جعفری جانتے ہیں کہ اختر حسین جعفری کی شاعری میں انسان کا ایک ازلی و ابدی تصور موجود ہے جو سماجی جبر سے نجات حاصل کر کے آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہ شاعری کا وہ مقام ہے جہاں انسان کا ماضی اور مستقبل اس کے حال میں پہلے جذب ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے شعور و لاشعور میں مختلف مناظر میں پھیل جاتے ہیں اور شاعر وجد میں آ کر ان مناظر کی تصویر اپنی تحریر میں اتار کر اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ایک ادب اور نفسیات کے طالبعلم ہونے کے ناتے جب میں نے ایزرا پاؤنڈ کے نظریات کی روشنی میں جدید شاعری کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کی تو مجھ پر یہ بھی منکشف ہوا کہ جدید شاعری سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے جدید شاعری کی روایت کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کی جدید نفسیات سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔

بیسویں صدی میں جہاں ایزرا پاؤنڈ نے کلاسیکی ادب کے محل میں نئے در بنوائے وہیں سگمنڈ فرائڈ نے روایتی نفسیات کے حبس زدہ مکان میں نئی کھڑکیاں وا کیں۔ فرائڈ نے انسانی ذہن کے بلیک باکس کے راز جانے اور ہمارا انسانی لاشعور اور آزار تلازمہ خیال سے تعارف کروایا۔ ان کی تحلیل نفسی کی تحقیق سے ہم انسانی ذہن کے بہت سے رازوں اور بصیرتوں سے واقف

ہوئے۔ فرائڈ نے ہمیں بتایا کہ انسان کے ذہن کے رازوں کو جاننے کے لیے شعور سے زیادہ لاشعور کو سمجھنا ضروری ہے۔

انسانی لاشعور پرائمری پروسس primary process سے اور انسانی شعور سیکنڈری پروسس secondary process سے سوچتا ہے۔

ماہرین نفسیات نے اپنی تحقیق سے یہ جانا کہ انسانی دماغ کے دو حصے ہیں۔ دایاں دماغ اور بایاں دماغ۔

بائیں دماغ کا زیادہ تعلق شعور سے ہے اور شعور کا زیادہ رشتہ منطقی سوچ، خیالات اور زبان سے ہے جبکہ دائیں دماغ کا زیادہ تعلق لاشعور سے ہے اور لاشعور کا زیادہ رشتہ جذبات اور احساسات سے ہے۔ یہ لاشعوری سوچ ہی ہے جو ہمیں رات کو خواب دکھاتی ہے اور دن کو شاعر سے شاعری کرواتی ہے۔

شاعری ہی نہیں دیگر فنون لطیفہ اور روحانیات کی بھی دائیں دماغ اور لاشعور سے گہری دوستی ہے۔

جدید شاعری کی بہتر تفہیم کے لیے ہمارے لیے یہ جاننا اہم ہے کہ دائیں دماغ کا قریبی رشتہ نظریات سے زیادہ جذبات، احساسات اور تصورات سے ہے اور وہ اپنا اظہار تصاویر اور امیجز کی صورت کرتا ہے۔ اسی لیے ہمیں خوابوں میں تصویریں نظر آتی ہیں۔

امریکی ماہر نفسیات سلوینو ایرئٹی SILVANO ARIETI فرماتے ہیں کہ فنون لطیفہ میں پرائمری پروسس اور سیکنڈری پروسس آپس میں بغلگیر ہو کر ٹرشری پروسس PROCESSTERTIARY بناتے ہیں اور شعور و لاشعور ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک جادوئی امتزاج تخلیق کرتے ہیں۔ اسی لیے ایرئٹی نے اپنی کتاب کا نام CREATIVITY: THE MAGIC SYNTHESIS رکھا۔

سلوانو ایرئٹی فرماتے ہیں کہ تخلیقی عمل میں شعور اور لاشعور 'خیالات اور جذبات' نظریات و احساسات، منطقی و غیر منطقی سوچیں آپس میں گھل مل کر حسین امتزاج بناتے ہیں۔ وہ ایک ایسا کیف و سرور تخلیق کرتے ہیں جہاں شاعر بے اختیار ہو کر وجدانی کیفیت میں کہتا ہے:

من تو شدم تو من شدی
تا کس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

اس عمل سے شاعری میں جدت پیدا ہوتی ہے اور شاعر نئی اور جدید نظم تخلیق کرتا ہے۔

جدید شاعر شعور سے زیادہ لاشعور کے اور بائیں دماغ سے زیادہ دائیں دماغ کے قریب ہوتا ہے اسی لیے اس کے خیالات جذبات اور احساسات اس کے لاشعور کے کینوس پر تصویریں بناتے ہیں جنہیں وہ

اپنی داخلی آنکھ سے دیکھتا ہے اور پھر اپنے لفظوں سے وہ تصویر کاغذ پر تحریر کرتا ہے۔

اختر حسین جعفری جہاں ایذرا پاؤنڈ سے فنی طور پر قریب تھے وہیں نظریاتی طور پر ان سے دور بھی تھے۔

ایذرا پاؤنڈ صرف شاعر تھے اس لیے انھیں صرف ادبی اقدار کا پاس تھا۔

اختر حسین جعفری جدید شاعر کے ساتھ ایک ترقی پسند دانشور بھی تھے اس لیے انھیں ادبی اقدار کے ساتھ ساتھ زندگی کی اقدار کا بھی پاس تھا۔

اختر حسین کے دو شانوں پر دو تقاضوں کا بھاری بوجھ تھا۔

ایک شانے پر فنی تقاضوں کا بوجھ اور دوسرے شانے پر زندگی کے تقاضوں کا بوجھ۔ اختر حسین جعفری کا مؤقف تھا کہ اس شاعر کو جو دانشور بھی ہو دو ذمہ داریوں کو نبھانا ہے۔ فنی ذمہ داری بھی اور نظریاتی ذمہ داری بھی۔ ادبی ذمہ داری بھی اور سماجی ذمہ داری ہے۔ یہ کام تخلیقی پل صراط پر چلنے کی طرح ہے۔

اختر حسین جعفری نے عمر بھر ایک شاعر اور دانشور ہونے کے ناتے فنی تقاضے ہی نہیں زندگی کے تقاضے بھی پورے کیے کیونکہ وہ ایک جدید شاعر ہی نہیں ایک ترقی پسند دانشور بھی تھے۔ وہ جہاں انسان کے داخلی مسائل سے جڑے ہوئے تھے وہیں انسان کے خارجی مسائل میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ جہاں آمروں اور جابروں کو چیلنج کرتے تھے وہیں مزدوروں اور کسانوں کی معاشی اور سماجی جدوجہد سے بھی ہمدردی رکھتے تھے۔ اختر حسین جعفری کے آدرش ایذرا پاؤنڈ کے آدرشوں سے اعلیٰ ہیں کیونکہ وہ داخلی آزادی کے ساتھ ساتھ سماجی آزادی کے بھی علمبردار ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اختر حسین جعفری کی شاعری سے محظوظ و مسحور ہونے کے لیے قاری کا جدید شاعری کی روایت کے ساتھ ساتھ جدید نفسیات اور جدید سماجیات سے بھی تعارف اہم ہے کیونکہ ان کی شاعری تھری ڈائمنشنل ہے۔ اسی لیے انہوں نے الفاظ سے ایسے آئینے تخلیق کیے ہیں جو ہمیں داخلی اور خارجی 'نفسیاتی اور سماجی' ادبی و نظریاتی حوالوں سے نئی دنیاؤں کے بارے میں سوچنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ ایسے آئینے ہیں جو ہمیں بصارتوں کے ساتھ ساتھ بصیرتوں کے تحفوں سے بھی نوازتے ہیں۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنی نظموں کے مجموعے کا نام۔ آئینہ خانہ۔ رکھا تھا۔ اس آئینہ خانے میں کہانی اور کہاوت اور حکایت عکس در عکس بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔

اختر حسین جعفری قاری کو تخلیقی طور پر اپنے تخلیقی عمل میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ تصویر جو شاعر کے ذہن میں بنتی ہے اور تحریر میں ڈھلتی ہے وہ تصویر ذہن قاری کے ذہن میں مکمل ہوتی ہے۔ اختر حسین جعفری کی تحریر کی تصویر قاری سے

کچھ تقاضے کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ قاری اس ادھوری تصویر کو اپنے تجربے اور مشاہدے اور ادبی و نظریاتی ذوق کی داخلی آنکھ سے مکمل کرے اور محظوظ و مسحور ہو۔

بدقسمتی سے اردو کا قاری مشاعرے کے شاعروں کو سن سن کر سہل پسند ہو گیا ہے۔ اس کے لیے شاعری تضیع اوقات کا حصہ بن گیا ہے - اس کے لیے شاعری ENTERTAINMENT کا حصہ ہے جبکہ ادب کا سنجیدہ قاری جانتا ہے کہ ادب عالیہ میں ENLIGHTEMENT بھی شامل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں:

شاعری جزو ایست از پیغمبری

بن جاتی ہے۔

جدید شاعر جانتا ہے کہ جس قدر جدید نظم تخلیق کرنے کے لیے درد زہ سہنا پڑتا ہے اسی طرح جدید قاری بننے کے لیے بھی یکسوئی، گہری سوچ اور اعلیٰ ذوق کی ضرورت ہے۔ جدید شاعر اپنی شاعری سے اپنے قاری کو تخلیقی عمل میں شامل ہونے کی، اپنے ادبی معیار کو اونچا کرنے کی اور اپنے فنی ذوق کو نکھارنے کی دعوت دیتا ہے۔

جدید شاعر ادب عالیہ کی وساطت سے اپنے قاری سے ایک فنی و نظریاتی رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لکھاری اور قاری کا رشتہ ایک مقدس رشتہ ہے کیونکہ وہ دانائی کا رشتہ ہے۔ ایسی دانائی جو ہمیں بہتر انسان بننے اور پرامن معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

جدید شاعر جانتا ہے کہ تخلیقی عمل چاہے وہ لکھاری کا ہو یا قاری کا ایک جاں گسل کام ہے۔

عارف عبدالمتین فرماتے ہیں:

معراج پر ہے کرب گوارا دماغ کا
تخلیق ہو رہا ہے سخنور کے ہاں سخن

.....

جہاں جدید شاعر نئی نظم تخلیق کرتے ہوئے درد زہ سے گزرتا ہے وہیں جدید قاری بھی نظم کے سمندر میں غوطہ لگاتا ہے اور اس نئی نظم میں نئے معانی دریافت کرتا ہے۔

بدقسمتی سے اختر حسین جعفری کو بہت کم صاحب ذوق و صاحب دل جدید قاری ملے۔ ہوسکتا ہے یہ مضمون اس جدید قاری کے امکان میں اضافہ کرے جس کی اختر حسین جعفری کی شاعری کئی دہائیوں سے راہ تک رہی ہے۔

میں امیر حسین جعفری کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھ سے ایسا ادبی مکالمہ کیا جس نے مجھے اختر حسین جعفری کی شاعری کے راز ہائے سربستہ جاننے میں مدد کی اور جدید شاعری کے قفل کو کھولنے کے لیے ایزرا پاؤنڈ کے مخصوص نظریات کی چابی تلاش کرنے کی تحریک و ترغیب دی۔

☆☆☆☆☆

امیر حسین جعفری

میں جب امیر حسین جعفری کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں اس بچے کا تصور ابھرتا ہے جو اپنے عہد کے جدید شاعر اختر حسین جعفری کی گود میں پلا بڑھا ہو اور جس کے گھر میں احمد ندیم قاسمی 'ضیا جالندھری' سیف الدین سیف 'نجیب احمد' خالد احمد اور ساقی فاروقی جیسے اردو ادب کے صف اول کے شعرا کا آنا جانا ہو۔

میں جب امیر حسین جعفری کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں اس نوجوان کی تصویر ابھرتی ہے جو پاکستان ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھتا تھا اور انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

میں جب امیر حسین جعفری کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اس جوان کا خیال آتا ہے جو ایوب خاور جیسے ڈائریکٹر اور ضیا محی الدین جیسے ایکٹر کا رفیق کار رہا ہو۔

میں جب امیر حسین جعفری کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے دماغ میں اس شاعر کا عکس ابھرتا ہے جو جدید شاعری کی تفہیم اور

خالد سہیل

تفسیر جاننے کے لیے اوکٹاویا پاز، ٹی ایس ایلیٹ، ایزرا پاؤنڈ اور پابلو نرودا جیسے ادیبوں کی شاعری اور تنقید کا مطالعہ کرتا تھا۔

میں جب امیر حسین جعفری کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں اس طالب علم کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے والد کی لائبریری میں کھو جاتا تھا اور ادب، فلسفہ، مذہب، نفسیات اور سماجیات کی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔

یہ وہ رنگ ہیں جنہوں نے مل کر امیر حسین جعفری کی ادبی شخصیت کی قوس قزح تخلیق کی اور اسے اپنے عہد کا ایک معتبر اور معزز شاعر اور ایکٹر، ڈائریکٹر اور دانشور بنایا۔

مجھے وہ سہ پہر یاد ہے جب میرے کامریڈ دوست سید عظیم نے فون پر خبر سنائی کہ امیر حسین جعفری لاہور سے ٹورانٹو نقل مکانی کر رہے ہیں۔

مجھے وہ شام یاد ہے جب جرارڈ سٹریٹ کے ایک سیمینار میں میری پہلی دفعہ امیر حسین جعفری اور ان کی شریک حیات سیمیں جاوید سے ملاقات ہوئی، میں نے ان کی خدمت میں اپنا شعری مجموعہ 'سمندر اور جزیرے' پیش کیا، اپنی دوست زہرا نقوی سے تعارف کروایا اور علی بابا ریسٹورانٹ میں کھانے کی دعوت دی۔

مجھے وہ مشاعرہ یاد ہے جس میں امیر حسین جعفری نے پہلی دفعہ اپنی نظمیں سنا کر سامعین کو محظوظ و مسحور کیا۔

مجھے رحمہ فاؤنڈیشن کا وہ پروگرام یاد ہے جس میں امیر حسین جعفری نے سٹیج پر اکٹنگ کا جادو جگایا اور حاضرین کا دل موہ لیا۔

مجھے فیملی آف دی ہارٹ کا وہ سیمینار یاد ہے جس میں امیر حسین جعفری نے جدید شاعری پر ایک عالمانہ مقالہ پڑھ کر سامعین کو متاثر کیا۔

مجھے رفیق سلطان کے گھر کی وہ محفل یاد ہے جس میں امیر حسین جعفری نے خالد احمد کی یاد میں ایک مضمون پڑھا اور حاضرین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

مجھے امیر حسین جعفری کے گھر کی وہ محفلیں یاد ہیں جن میں ہم نے ان کے دونوں بیٹوں زائر حسین جعفری اور اختر حسین جعفری جونیر کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اس موضوع پر گفتگو کی کہ ادیب اور شاعر اپنی ادبی، سماجی اور خاندانی زندگی میں کیسے توازن پیدا کرتے ہیں۔

مجھے وہ ویک اینڈ بھی یاد ہے جب امیر حسین جعفری کے بھائی مظہر حسین اختر کو ان کے مجموعہ کلام 'سطر نو' پر پاکستان میں ایوارڈ ملا اور میں نے امیر حسین جعفری سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان انہیں بھی اپنا دیوان چھپوالینا چاہیے۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ امیر حسین جعفری جیسا دانشور شاعر میرا دوست ہی نہیں میرا ادبی ہمسفر بھی ہے۔ اس کی شاعری اور زندگی میں اتنا گمبھیرتا ہے کہ اس پر ایک ناول یا تین گھنٹے کا ڈرامہ لکھا جا سکتا ہے۔ میں نے اس ڈرامے کے بارے میں ایک نثری نظم لکھی تھی جس کا عنوان ہے:

اس کی زندگی کے
سکرین پلے کا ون لائنر

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں
وہ وقت سے پہلے اتنا بزرگ کیسے بن گیا ہے
اس کی باتوں میں اتنی گہرائی اور دانائی کہاں سے آئی ہے

اور میں انہیں بتاتا ہوں
نوجوانی میں
اس کے دل میں
ایک ذہین عورت کی محبت کی کلی کھلی تھی
اور ابھی وہ کلی
پوری طرح پھول بھی نہ بن پائی تھی کہ
اس کے شاعر والد کا انتقال ہو گیا

اور وہ چاروں طرف بکھر گیا
اپنے والد کی لائبریری میں کھو گیا
اس نے جب خود کو سمیٹا تو
وہ ایک شاعر بن چکا تھا
وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا

اب وہ
روایت اور بغاوت
قدیم اور جدید کے
چوراہے پر کھڑا
کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا ہے
شعر کہتا ہے
دانائی کی باتیں کرتا ہے
اور لوگوں کو حیران کرتا ہے
لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں
وہ وقت سے پہلے اتنا بزرگ کیسے بن گیا ہے
اور میں خاموش رہتا ہوں

☆☆☆☆☆

ادرا کی تنقید، مشرق کا نمائندہ دبستان

ادرا کی تنقید کا جواز

نئی فلسفیانہ بنیادوں کی ضرورت

دوسری جنگ عظیم کے صدمے نے جہاں اہلِ شعور و دانش کے ذہنوں میں انسان کے ہونے، اس کے تشخص، شناخت، آزادی، معنویت اور مقصد سے متعلق سوالات کو جنم دیا وہاں جزوی طور پر جنگ ہار جانے والی استعماری قوتوں کو اپنے کمزور ہونے کا احساس دلانے کے ساتھ ساتھ کمزوریوں کا جائزہ لینے اور ان کا ازالہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ جس کے نتیجے میں دنیا کے ہر شعبۂ حیات میں بڑی تیزی سے دخل اندازی کا سرعت کے ساتھ آغاز ہوا اور تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ یہ سب کچھ مغرب میں بہت تیزی سے جبکہ مشرق میں بہت آہستگی کے ساتھ جاری کیا گیا۔ 1950 سے اب تک سرمایہ داری نظام نے جس بلا خیز رفتار سے ترقی کی وہ پہلے کبھی رونما نہیں ہوئی۔ جس کی ایک وجہ تو جنگ عظیم میں ہونے والی تباہ کاریوں کے باعث پیدا ہونے والی عالمی معاشی کمزوری، مغربی معاشروں کا نفسیاتی بحران اور فرد کا اپنے بے معنی ہونے کا احساس جیسے مسائل تھے اور دوسرا مناسب ترین موقع جانتے ہوئے عالمی سرمایہ دار پہلے سے زیادہ متحرک ہو گئے - نتیجتاً غیر پیداواری سرمایہ کاری کے فروغ کے ساتھ ساتھ ساختیات جیسے فلسفوں اور نظریات کے پرچار کی سوچ حقیقی انسانی آزادی کے تمام نظریات کی نفی پر عمل پیرا ہوتی دکھائی دینے لگی۔ سرمایہ دار طبقہ جہاں دنیا کو معاشی طور پر دبوچ لینے کے منصوبے پر آگے بڑھتا دکھائی دیا وہیں فکری آزادی کے گرد کسے جانے والے شکنجوں کو بھی کام میں لایا جانے لگا جن کا مقصد مختصراً یہ تھا کہ

فرحت عباس شاہ

پہلے تو انسانی سوچ، فکر، خیال اور ادراک کی داخلی تعبیر کے بجائے خارجی ڈھانچوں کے مطابق کیے جانے کو رواج دیا جائے اور پھر فرد، اس کی شناخت اور معنویت کو کسی خارجی پھیلاؤ کا شکار کر کے کچل دیا جائے۔

اب اس سارے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کو مستعار نظریوں پر اپنی فکر کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے ضرورت مند دانشور درکار تھے جو ان کی مرضی کی تھیوریاں گھڑیں اور انھیں فروغ دیں۔ دوسرا اسے علمی ادبی سنجیدہ مباحث کا حصہ بنا کر مخالف فکر کے سامنے کھڑا کر کے اذہان کو کنفیوژن کا شکار بنانے کے ساتھ ساتھ حقیقی تخلیقی نابغوں کو بے وقعت کر کے مصنوعی نابغوں کو بے مثال قرار دیا جائے تا کہ معاشروں کے مزاج کو اجتماعی سطح پر حسبِ منشا کنٹرول کیا جائے۔

میں حیران ہوں کہ گزشتہ ستر سالوں میں پاکستان اور بھارت دونوں ممالک میں معدودے مارکسی دانشوروں کے علاوہ شاید ہی کسی نے اتنی بڑی علمی اور فکری سازش کو سمجھا ہو یا اس کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ رہا ان تھیوریوں کے رد کے بعد نئی تشکیلات یا نظریہ سازی کا معاملہ، اس کا تو سرے سے بیڑا ہی غرق نظر آتا ہے۔ بات بس اتفاق اور اختلاف پر مبنی مباحث تک ہی محدود رہی جنھوں نے کنفیوژن کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا کر پھر اسی سرمایہ دارانہ ایجنڈے کو تقویت دی۔

اس تمام صورتحال کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی تھیوری سامنے لائی جائے جو دنیا بھر میں کمزور کر کے رکھ دی گئی حریتِ فکر اور آزادیٔ تخلیقی عمل کی طرف توجہ دلائے اور اس کی معاشروں کے لیے اہمیت کے شعور کو اجاگر کرے۔ احساس اور محسوس کے ابلاغ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرد کو احساس تنہائی سے نجات دلائے اور آنے والی نسلوں کی تجزیاتی فکر کو تقویت دے کر اس کی حفاظت کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادرا کی تنقید جیسے نظریے کی جتنی آج ضرورت ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا بنیادی مقصد فکری استحصال کرنے والی تھیوریوں کو رد کر کے تخلیقی سچائی کا دفاع کرنا ہے۔

ادرا کی تنقید

اگرچہ علم کو کسی جغرافیے یا زبان تک محدود نہیں کیا جا سکتا اور نہ پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے کیونکہ علم نہ تو کسی کی میراث ہے نہ ملکیت نہ اس کا کوئی موسم ہے نہ سرحد لیکن علم تک رسائی کے طریقہ ہائے کار مختلف ہو سکتے ہیں۔ میری نظر میں قوانین فطرت کی دریافت علم تک پہنچنے کا پہلا زینہ ہے علم چاہے داخلی ہو یا خارجی یعنی چاہے وہ انسان کے باطن سے تعلق رکھتا ہو یا خارج سے اس تک پہنچنے کا طریقہ علم کی نوعیت کے مطابق

جتنا فطری ہوگا اتنا کامیاب ٹھہرے گا۔
نظام تخلیق کا تعلق چونکہ انسان کے باطن سے ہے اس لیے اس تک رسائی اور اس کی پُراسراریت کو سمجھنے کے لیے انسانی تخیل، خواب، فکر، محسوسات، جذبات یعنی ذہنی عمل کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ اگرچہ نفسیات انسانی ذہن کی سائنس ہونے کے ناطے اس کی تعبیر و تشریح میں کافی آگے بڑھ چکی ہے لیکن تخلیقی عمل ابھی ابتدائی سطح پر زیر مشاہدہ و مباحثہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آمد و الہام کو جب تک کسی لیبارٹری میں پرکھا نہیں جاتا اور اس کا فارمولا سامنے نہیں لایا جاتا اس وقت تک اس کی تشریح ادب اور فلسفے کا ہی موضوع رہے گی۔
میرے نزدیک عمل تخلیق کی موزوں ترین تعریف یہ ہے کہ نامعلوم کے معلوم اور پھر معلوم کے وجود میں آنے کی جمالیات کا نام تخلیق ہے۔ بعض اوقات یہ معلوم سے وسیع معلوم اور اس وسیع معلوم سے وجود کے عمل سے بھی گزرتی ہے۔ اس کی مزید وضاحت اگلے صفحات پر بھی نظر آئے گی۔
ادبی یا فنی تخلیق سے مراد وہ باضابطہ اظہار ہے جو کسی انسان کی باطنی اور خارجی ریاضت کے تعامل سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔
باطنی ریاضت سے مراد خیال، جذبے، احساس، سوچ اور ادراک کی ریاضت ہے اور خارجی ریاضت سے مراد تجربے، مشاہدے، مطالعے اور ابلاغی مہارتوں کی ریاضت ہے۔
میں نے آگے چل کے اس لطیف اور غیر مرئی تانے بانے یعنی شعر کے مابعد الطبیعاتی ماخذ کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے جسے تخلیق یا شعر کے مابعد الطبیعاتی سٹرکچر کا نام دیا ہے۔ زیر نظر سطور میں میری کوشش ہے کہ ادراک کی تنقید اور اس کی ضرورت کی وضاحت کروں۔ جس کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ادراک کیا ہے؟
اگرچہ معاملاتِ علم میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی اور کسی بھی شے، علم یا فن کے ارتقا اور اس کی مزید یا مختلف تفہیم و تعبیر کا امکان ہمیشہ رہتا ہے لیکن ادراک کی اب تک کی سب سے مقبول و منظور تعریف علم نفسیات نے کی ہے۔ ماہرین کے مطابق ہر انسان اپنی گزشتہ آموزش اور وقوف کی روشنی میں جب کسی شے کو معنی دیتا ہے تو اسے ادراک کہتے ہیں۔
میرے خیال کے مطابق ادراک کی نوعیت کے اعتبار سے تین درجوں پہ کلاسیفیکیشن کی جاسکتی ہے ایک انفرادی ادراک، دوسرا گروہی ادراک اور تیسرا اجتماعی ادراک اور ماہیت کے اعتبار سے اس کو دو سطحوں پر سمجھنے کی کوشش ادراک کی مزید پرتیں کھولنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

پہلی معروضی یا خارجی ادراک اور دوسری موضوعی یا داخلی ادراک۔ اسی طرح اسے مزید سمجھنے کے لیے ادراک کی دونوں ماہیتوں کو ہر نوعیت کے سیاق وسباق میں رکھ کر مزید تشریح سے اس کا دائرہ کار وضع کیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ کلیدی نکتہ ہے جس پر میرا نظریہ انتقاد استوار ہے۔

ہر تخلیق کار بنیادی طور پر اپنے تخیلاتی اور کیفیاتی ادراک کو لسانی، تصویری و مجسماتی، صوتی یا حرکی ادراک کے منضبط اور جمالیاتی پیرائے میں جب سامنے لاتا ہے تو وہ دراصل اپنے موضوعی اور معروضی ادراک کے ملاپ سے اس کے خدوخال ترتیب دیتا ہے۔ جسے پڑھنے، دیکھنے اور سننے والا اپنے موضوعی اور معروضی ادراک سے وصول کرتا ہے۔ تخلیقی عمل میں جس طرح کوئی بھی تخلیق کار بطور ایک فرد اپنے انفرادی ادراک کا مظاہرہ کرتا ہے اسی طرح اسے دیکھنے، سننے اور پڑھنے والا اپنے انفرادی ادراک کی روشنی میں اس سے حظ اٹھاتا ہے یا نہیں اٹھاتا۔

تخلیق کار کا تخلیقی ادراک اور اظہار جتنا ذاتی یا آفاقی ہوگا اپنے خارج میں وہ اتنا ہی ذاتی یا آفاقی سطح پر قبولیت پائے گا۔

اگرچہ ادراک کی سطح پر انسان کا اشیا کے بارے میں علم خارج سے باطن کا سفر طے کرتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کسی ایک ہی شے یا واقعے سے منسلک مختلف تجربہ انسان کے اندر مختلف کیفیت، تاثر اور خیال پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے یا کسی خاص عمل یا مہیج کے جواب میں مختلف انسانوں کا ذہن ایک دوسرے سے مختلف ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن فنکار یا تخلیق کار اسے دوسرے لوگوں تک پہنچا کر یعنی اپنے ادراک کو اس کی موثر ترسیل سے اپنے تجربے سے دوسرے انسان کے ادراک کا حصہ بنانے پر قادر ہوتا ہے۔

ایک اور صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ عام انسان اپنے جس تجربے یا نظریے کے ادراک کی ترسیل یا ابلاغ سے قاصر رہتا ہے تخلیق کار اپنے آفاقی ادراک کی بدولت اس کی زبان بن جاتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ادراک کے بغیر نہ تو کچھ تخلیق کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی تخلیق کو سمجھا یا اس سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے اور یہی ادراک موجود مغربی و مشرقی تھیوریوں کی موجودگی میں نئی اور مناسب ترین تھیوری یا نظریے کے وضع کیے جانے کا جواز مہیا کرتا ہے۔

مغربی تھیوریاں تو چونکہ ویسے ہی مشرقی احساس، کیفیت، اندازِ فکر اور طرزِ تخلیق سے نابلد ہونے کے باعث مشرقی تخلیقی اذہان کے قرینۂ احساس و فکر تک رسائی کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ مثال کے طور پر ہماری غزل کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہمیشہ عجز کا شکار

ثابت ہوا ہے - احساساتی نظموں کو ٹرانسلیٹ کیے جانے کے باوجود لفظ تو ترجمے میں ڈھل گئے لیکن احساس کبھی ٹرانسلیٹ نہیں ہو پایا- ان نامانوس اور اجنبی بدیسی تھیوریوں کی طرح زیادہ تر مشرقی نقدو نظر میں بھی اِتنا مرکوز اور جامع پیمانہ سامنے نہیں آسکا جس کے ذریعے ہم ادھر ادھر بھٹکے بغیر تخلیق کی نازک پرتوں کے تجزیے کا حق ادا کرسکیں کیونکہ ہم نے ادراکی پیمانے کو استعمال کرنے کے باوجود آج سے پہلے اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور نہ ہی اس کے قواعد وضوابط بنا کے اسے تنقیدی ڈسپلن بنانے کی کوشش کی ہے

یہاں ایک اور اہم بات کا بھی ذکر کرتا چلوں کہ کسی بھی تخلیق پارے یا اس کے خالق کا تجزیہ کرتے ہوئے عمومی اور خصوصی ہر دو طرح کے ادراک سے کام لینا ہوگا- عمومی ادراک ناقد کو رائج اور سامنے کی تفہیم تک پہنچائے گا اور خصوصی ادراک تہ در تہ معنویت اور استعاراتی نظام کے اسرار و رموز تک پہنچانے کا وسیلہ بنے گا-

میرے نقطہء نظر کے مطابق اگر کسی ناول یا افسانے میں ناول نگار کی داخلیت شامل نہ ہو تو وہ تذکرہ نگاری یا واقعہ نگاری تو ہوسکتی ہے ناول نگاری نہیں ہوسکتی اور علامتی فکشن میں تو داخلیت ہی محور و مرکز ہوا کرتی ہے- اب یہ ناقد کے خصوصی ادراک پر منحصر ہے کہ وہ داخلیت کی کس پرت تک پہنچ پاتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قاری یا ناقد کہانی کے راستے مصنف تک نہیں پہنچتا- میں یہ بات ماننے پہ بھی تیار نہیں ہوں کہ ناول، افسانہ یا شاعری پڑھتے ہوئے لطف محسوس کیے بغیر اس کے ادراک کا حقیقی معنوں میں حق ادا کیا جاسکتا ہے-

اب اگر میں یہ کہوں کہ ادراکی تنقید کسی تخلیق پارے سے لطف لینے اور اسے سمجھنے کے لیے اس فطری طریقے کی نشاندہی ہے جو ہم صدیوں سے اپنائے ہوئے ہیں تو غلط نہیں ہوگا- تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک فطری طریقے کی موجودگی میں غیر فطری طریقوں کو پیمانہ بنا کر فنون لطیفہ اور علم ادب کو مشکل کیوں بنایا جارہا ہے- اس کا جواب میں بدیسی تھیوریوں پر بحث کے دوران تفصیل سے دے چکا ہوں- جو اسی کتاب میں شامل کیا گیا ہے- ادبی تنقید کرنے سے پہلے ناقد کے لیے جو سب سے اہم بات سمجھنے یا برتنے کی ہے کہ ادراکی تنقید کسی ادب پارے کی حقیقی تفہیم کے لیے زبان کا عمومی اور مروج ادراک بھی اہم تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ زبان کی تخلیقی معنویت کے اسرار منکشف کرنے کی اساس بھی فراہم کرتی ہے- زبان ذریعۂ ابلاغ ہے اور یہ کبھی خیال کے بغیر نہیں ہوتی لیکن چونکہ ادب کو سادہ اظہار قرار نہیں دیا جاسکتا

اور نہ ہی میں ٹی ایس ایلیٹ کی اس سرسری اور غیر مناسب تعریف سے متفق ہوں کہ ''شاعری جذبات کا بے ساختہ ابال ہے'' کیونکہ بے ساختہ ابال تو غصہ آنے پر گالی گلوچ، کسی قریبی کی موت کی خبر سن کر آہ و بکا اور چوٹ لگنے پر ہائے اوئی کا واویلا بھی ہے۔ میرے نزدیک شاعری جذبات و احساسات، خیالات اور فکر کا منظم، مہذب اور منضبط جمالیاتی اظہار ہے۔ اس لیے نقاد کو تخلیق کار کی استعاراتی اور علامتی زبان کے نظام کو بھی سمجھنا ہوگا۔ یہ تفہیم اس وقت زیادہ آسان ہوگی جب نقاد تخلیقی اہلیت کا حامل ہوگا اور اسے تخلیقی عمل کا تجربہ ہوگا وگرنہ اگر نقاد غیر تخلیقی ہوگا تو اسے پتہ ہی نہیں ہوگا کہ بظاہر ناقابل بیان کیفیات کے تخلیقی اظہار کے لیے تخلیق کار کس طرح متعین معنویات کا سیاق و سباق بدل کر الفاظ کو نئے معانی عطا کرتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ مونجھ اور عشق جیسے الفاظ کا نعم البدل کسی دوسری زبان میں موجود ہے۔ یعنی الفاظ کے معانی اپنے اندر نہ صرف کسی معاشرے کے جغرافیائی مزاج کی روح لیے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور معاشی آرکیٹیکچر سے تشکیل پانے والی اظہاری رسموں سے بھی آراستہ ہوتے ہیں۔ لسانی ادراک کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اس سے نقاد تخلیق کار کی خارجی فنی دسترس کی تعبیر و تجزیہ آسانی سے کر سکتا ہے کیونکہ اردو ادب کا ایک اہم وصف زبان کا چٹخارہ بھی ہے۔ نقاد کے لیے جتنا اہم لسانی ادراک ہے اتنا ہی اہم احساساتی ادراک بھی ہے جو انسانی باطن کے مد و جزر میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اگرچہ ادب کا کوئی بھی قاری یا ناقد کسی فن پارے کے مطالعے سے لطف لینے اور حظ اٹھانے یا نہ اٹھانے سے اس تخلیقی اظہاریے کے مرتبے کا بنیادی تعین تو کر ہی سکتا ہے لیکن یہاں بھی قاری یا ناقد کے ادراک اور تخلیق کار کے ادراک کی ویولینتھ اور فریکوئنسی کا قریب قریب ہونا بہت ضروری ہے نہیں تو اسے کچھ مزید سہاروں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کسی بھی تخلیق پارے پر تنقید کے لیے اس زمانے اور عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا ادراک، لوگوں کے رہن سہن، رسوم و رواج، مذہب، عقیدے، اخلاقیات، عہد میں جاری و ساری علوم و فنون، عوام اور خواص کے مباحث، غالب رویے، سماجی اشتراکات و تضادات اور فکری حالات کا شعور بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ زبان، الفاظ اور ان کے برتاوے کے انداز و اطوار کا۔ میں تو یہ تک کہنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ نقاد کے لیے ان موسموں کا جاننا بھی اہمیت رکھتا ہے جو تخلیق کار کو زندگی بھر یا دوران تخلیق گزارنے ہوتے ہیں۔

ہوسکتا ہے میں جو کچھ درج بالا سطور میں کہہ چکا ہوں یہ سب پہلے سے ہی تنقیدی محاکموں کے لیے استعمال میں لایا جا رہا ہو لیکن اگر اسے کسی منضبط طریقہ کار کے مطابق ایک تھیوری کے طور پر اپلائی کیا جائے گا تو بدیسی اور غیر فطری تھیوریوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ سوال پیدا ہونا ایک فطری امر ہے کہ جب پہلے اتنے دبستانِ تنقید موجود ہیں تو پھر ادرا کی تنقید کیوں۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ پہلے سے موجود دبستان براہ راست فنونِ لطیفہ کی پرکھ پرچول کے لیے نہیں بنائے گئے بلکہ پہلے سے موجود نظریات کے معاشروں اور فرد پر اثرات اور اثر و نفوذ کے باعث مؤثر نقطۂ نظر کے طور پر ان کی روشنی میں تخلیق کی پرکھ پرچول کی ضرورت کے تحت لاگو کیے گئے ہیں جبکہ ادرا کی تنقید تمام فنونِ لطیفہ پر بالعموم اور ادب پر بالخصوص نقد و نظر کے لیے معرضِ وجود میں لائی گئی ہے۔

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ انسانی ادراک کسی ایک علم یا فن کے شعور کی کلید نہیں بلکہ پوری کائنات کے شعور کی کلید ہے اور یہ کسی ایک زمانے یا کسی مخصوص جغرافیے یا تہذیب و تمدن اور شعبے تک محدود نہیں۔

ادرا کی تنقید پہلے سے موجود تصورات و نظریات کی عینک سے ادب کی چھان پھٹک کے بجائے خالصتاً فنون کو ان کے بنیادی تخلیقی جواز کے آئینے میں دیکھنے کا نام ہے۔ ادیب کوئی ناول کیوں لکھتا ہے؟ کوئی مصور تصویر کیوں بناتا ہے؟ کیسے بناتا ہے؟ اور وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس کے معیار اور مرتبے کا تعین کیسے کیا جائے؟ کوئی قاری شاعری کیوں پڑھتا ہے؟ کوئی نظم اسے کیوں اور کتنی پسند آئی ہے؟ کسی سامع نے گیت کی دھن سے کتنا لطف و سرور حاصل کیا ہے۔ یہ اور اس جیسے تمام سوالوں کا جواب ادرا کی تنقید کے فلسفے کے اساسی زاویے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ نفسیاتی، عمرانی یا مارکسی تنقیدی نقطۂ نظر سے کسی تخلیقی کام کا تجزیہ کرنے والا خود بھی اپنے ادراک سے ہی کام لے رہا ہوتا ہے لیکن مجھے اس کے لیے مخصوص ادراک اور آزاد ادراک کی اصطلاحیں وضع کرنی پڑیں گے اور اس بات پر زور دینا پڑے گا کہ اگر کوئی نقاد کسی تخلیق کار یا اس کی تخلیق کی پرکھ پرچول اپنے نقطۂ نظر سے کرے تو اس کا اسے پورا پورا حق حاصل ہے لیکن اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ اپنی ہی ٹوپی تخلیق کار کے سر پر بھی رکھ دے اور اسے اپنے خانے میں زبردستی فٹ کرنے کی کوشش کرے۔ لسانیاتی اور ساختیاتی ناقدین تو یہ حد بھی پھلانگ چکے ہیں کہ اپنے فریم آف ورک

سے باہر نکل کر کچھ دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے پر تیار ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے دائرے اس لچک سے محروم ہیں جو فنون کی تفہیم و تعبیر کے لیے ناگزیر ہے۔

یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ادرا کی تنقیدی دبستان کی حیثیت آفاقی ہے۔ ہر علاقے زبان اور تہذیب و تمدن کے ناقدین اپنی اپنی قوتِ مدرکہ کے مطابق دنیا کے کسی بھی فن پارے کا تجزیہ و تفہیم کر سکتے ہیں اور اپنے سیاق و سباق کے مطابق اس کے معائب و محاسن بھی بیان کر سکتے ہیں۔

ادرا کی تنقید کا حسن یہ ہے کہ نقاد کو تخلیق پر نقد و نظر کے لیے دوسرے ماہرین کے فریم ورک اور اصطلاحات کا غیر ضروری سہارا لینے کی معذوری نہیں رہ جاتی بلکہ وہ براہ راست اپنے ادراک پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کر سکتا ہے اور یوں خود تنقید ایک ثانوی تخلیق کا درجہ حاصل کر لے گی۔ جو اگرچہ تخلیق پارے سے مشروط تو ہوگی لیکن نقاد کے انفرادی ادراک کے ناقدانہ اظہار سے شراکت تخلیق کا موجب بنے گی اور کوئی اگلا نقاد اس پر اپنے تجزیاتی تبصرے سے نقد و نظر کے اس سلسلے کو معلوماتی زاویے کے بجائے علمی زاویے سے آگے بڑھا سکے گا اور تخلیقی تنقید کے بند دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

ادرا کی تنقید نقد و نظر پر اٹھائے جانے والے اعتراضات یعنی اس کے استخراجی اور میکانکی وغیرہ ہونے کے ازالے کا موقع فراہم کرتی ہے اور اسے بہت سارے چھوٹے چھوٹے دائروں سے نکال کر ایک آزاد پنچھی کی طرح آزادی سے اڑنے کے لیے وسیع و عریض اور لامتناہی فضائیں مہیا کرتی ہے۔ یہی وہ دبستان ہے جس میں نقاد سے تخلیق کے حوالے سے کسی فتوے پر اصرار کے بجائے اس کی آزاد، بے لاگ اور مخلصانہ رائے کو فوقیت حاصل ہوگی۔

جہاں ادرا کی تنقید ناقد کو ان گنت آزادیاں فراہم کرتی ہے وہیں اس پر اس کے ناقدانہ گناہ و ثواب کو قبول کرنے کی ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے کہ نقاد حسبِ ادراک جو تجزیہ و تفہیم پیش کرے گا وہ جہاں کسی فن پارے کے بارے میں اپنی فہم و فراست کا اظہار کرے گا وہیں وہ اسی عمل میں اپنی فہم و فراست کی حدود و قیود اور وسعت یا تنگ دامنی کا ثبوت بھی پیش کر رہا ہوگا۔ یوں تخلیق کار کے ذمہ داری لینے سے فن تنقید سے تخلیق کار کا گلہ اگر اسے ہے تو منتقل ہو کر نقاد کی ذاتی رائے تک محدود ہو جائے گا جس سے فن تنقید کا متنازعہ ہونا یا تو ختم ہو جائے گا یا اس کی شدت میں کمی آجائے گی۔ کیونکہ اپنے تخلیق پارے پر کسی قسم کی رائے کی آزادی کی اہمیت کو ہر باشعور تخلیق کار اچھی

طرح سمجھتا ہے اور اسے پتہ ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیق کو نہ تو جبراً کسی پر مسلط کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ناپسند کیے جانے کا حق کسی سے چھین سکتا ہے۔

تنقید کے مختلف دبستان اپنی اپنی نظریاتی روح اور تصورات کی روشنی میں ہی تنقیدی اصول وضع کرتے ہیں جس کے باعث نقاد نظری اور ادراکی سطح پر تخلیق سے دور اور دبستانی مآخذ کے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے جبکہ ادراکی تنقید میں تفہیم کی سمت تخلیق کا اثر اور قوت متعین کرتی ہے۔ ایک عام قاری تخلیق کو پسند ناپسند کے اور متفق نامتفق کے بنیادی اصول سے آگے نہیں بڑھتا اور اسے اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی اور اس تخلیق کے بارے میں کیسی رائے رکھتا لیکن نقاد کے لیے یہ بھی دیکھنا ذمہ داری بن جاتی ہے کہ زیر انتقاد تخلیق کو کون کون پسند کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے اور کون کون اسے ناپسند کر رہا ہے اور کیوں۔ یہاں کون سے مراد افراد نہیں بلکہ مختلف ادراکی استعداد رکھنے والے قارئین ہیں۔

فنون کے بنیادی قواعد و ضوابط طے کیے جا چکے ہیں مثلاً موسیقی میں سُر اور لے، آواز کی خوبصورتی اور مخرج کی درستگی اور راگ کی صحیح خوانی سُر کی پکڑ اور چھڑاو وغیرہ اسی طرح مصوری میں لکیر اور دائرے کی مہارت رنگوں کا بہاو ڈرائنگ پر گرفت فاصلے اور تناسب کی درستگی اور ادب میں اصناف کی تعریف اور اصول و ضوابط صحت زبان اور آہنگ وغیرہ۔ ان کی روشنی میں ہی ماہرین یا ناقدین اس پر نقد و نظر پیش کرتے چلے آ رہے ہیں جن کی آرا میں کہیں اتفاق اور کہیں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن خارجیت مکمل ادب یا مکمل فن نہیں ہے۔ داخلیت کو نظر انداز کر کے یا اس کی نفی کر کے نہ تو تخلیق کے معیار کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے اور یہی ادراکی تنقید کا حسن ہے کیونکہ تخلیق کا معاملہ کم از کم داخلی سطح پر غیر سائنسی ہے جسے میکینکل تھیوریوں کے نشانے پر رکھنا سراسر بے انصافی بلکہ بد دیانتی ہے۔ اگرچہ خارج میں زبان، الفاظ و معانی اور ان کے برتاؤ کے معاملات طے شدہ بھی ہیں اور گنجائش کی جگہ بھی خالی رکھی جاتی ہے لیکن کیفیت اور احساس کی شدت ابھی تک سب انسانوں میں موجود ہونے کے باوجود ایک انفرادی معاملہ ہے اور یہ کہ تخلیق اور تفہیم دونوں سطح پر انفرادی ہے لہٰذا اس میں اختلاف فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی شعر مختلف قارئین پر مختلف انداز میں کھلتا اور مختلف تاثر چھوڑتا ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ زبان، کرافٹ، اسلوب، خیال، فکر اور نظریے پر گرفت موضوعی ہونے سے زیادہ معروضی ہے اور یہ بیک وقت ایک سے زیادہ قارئین پر ایک جیسی، یکساں یا قریب قریب تاثر چھوڑتی

ہے۔ جیسے نظم اگر موضوعاتی ہو تو ناقدین کی اکثریت آسانی سے بھانپ لیتی ہے کہ موضوع سے انصاف ہو پایا ہے یا نہیں۔ البتہ کیفیت اور شدت احساس کا معاملہ مختلف ہے۔ کسی شاعر کے کلام میں شدت احساس کو پرکھنے کا معاملہ خالصتاً داخلی ادراک کا معاملہ ہے اور یہ نقاد کے داخلی ادراک سے قریب قریب تفہیم کی توقع رکھتا ہے اور متقاضی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر معروضیت کے قائل ماہرین مجبور محض نظر آتے ہیں اور فنون لطیفہ کو پرکھنے کے سائنسی پیمانے بنانے پر تلے رہتے ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ دنیا کے تمام علوم کو سائنس کے تابع کرنے پر اصرار بلکہ ضد کا جواز کیا ہے؟ جبکہ مذہب، روحانیت اور تخلیقی فنون نے انسانی معاشروں اور فرد کو اس خوشی اور سکون سے نوازا ہے جو سائنس نہیں دے سکی۔ کیونکہ سائنسی ترقی کے باعث آفر کی جانے والی خوشی کے پیچھے ہمیشہ سرمائے کا وہ جبر کارفرما ہوتا ہے جس نے انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے دولت مندوں کو گاہکوں اور غریبوں کو محرومیوں میں بدل دیا ہے۔ حتیٰ کہ مصوری جیسے آرٹ کو اتنا کمرشل کیا جا چکا ہے کہ پینٹنگز تو کیا غریب آدمی کے لیے کسی آرٹ گیلری تک رسائی بھی ممکن نہیں رہی اور پینٹنگز کی ملکیت کو سٹیٹس سمبل بنا دیئے جانے کی کامیابی حاصل کر لی گئی ہے۔ یہی حال موسیقی کا کیا جا رہا ہے۔ اعصاب کو سکون دینے والی اور جذبات کو طمانیت بخشنے والی موسیقی کی جگہ شور زدہ موسیقی کو فروغ دے کر اس کے ساتھ سرمائے کو لازم و ملزوم بنا دیا گیا ہے اور دوسری طرف انتشار اور بے چینی میں اضافہ کرنے والی موسیقی کو کمرشل بنیادوں پر اتنا پھیلایا جا رہا ہے کہ اس کے سامنے پوری دنیا بے بس نظر آتی ہے۔ خوبصورت تخلیقی دھنیں بنانے والوں کو معاشی شکنجوں میں کس کر آن لائن تھیلے بیچنے جیسے کاموں پر لگنے پہ مجبور کر دیا گیا ہے۔ شاعر اور ادیب کو تو پہلے ہی عضوِ معطل سمجھا جاتا تھا اس پہ طرہ یہ کہ مصنوعی تھیوریوں اور مصنوعی ناقدین کے ذریعے اب اس کے احساس اور احساس کے ابلاغ کی نہ صرف نفی کی جا رہی ہے بلکہ اس نفی کو علم بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ سائنسی بنیادوں پر تخلیق کو پرکھنے کا جھانسہ اتنے مؤثر انداز میں دیا جا رہا ہے کہ اہلِ دانش اس کی اطاعت میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔

ادراکی تنقیدی اصول کے مطابق فنون لطیفہ کے ناقدین کے لیے علوم کو زبردستی سائنسی دائرۂ کار میں لانے کی کوشش کے پیچھے چھپے مقاصد کی تہ تک پہنچنا از حد ضروری ہے وگرنہ اس کے لیے آرٹس کی روح اور تخلیق کی قدر و قیمت کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

ادرا کی تنقید کی تھیوری اس پورے گورکھ دھندے کو حقیقی اور خالص علمی کام سے انکار کرتی ہے اور یہ اصول وضع کرتی ہے کہ انسان کو معدنیاتی اور طبیعاتی مظہر سمجھنے کے بجائے ادرا کی مظہر سمجھتے ہوئے تخلیق جیسی اعلیٰ صفت کو ادراک جیسے اعلیٰ پیمانے سے ہی ناپا تولہ اور پرکھا جائے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ایسے ناقدین اس تخلیق کی جانچ پڑتال کریں جو اس جیسا نہیں تو کم سے کم اس سے ملتے جلتے ادراک کے حامل ہوں۔ جس نقاد کا مزاج ہی شاعرانہ نہ ہو، جو شعر سے حظ اٹھانے کا ذوق ہی نہ رکھتا ہو اسے شاعری پر تنقید کا حق نہیں دیا جا سکتا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ ناقد تہذیب، معاشرے اور انسانی نفسیات کے بنیادی شعور کا حامل ہو۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ تخلیق سے متعلق شائقین کے ردعمل کا اندازہ لگانے کا اہل ہو۔

پانچواں یہ کہ انسانی رویوں اور نظریوں سے آگاہی رکھتا ہو اور مثبت نظریات کے احترام کا حامل ہو۔

چھٹا اصول ہے کہ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ کے رائج اور لغوی معنوں سے واقفیت کے علاوہ ان کے تہذیبی اور تخلیقی معنوں میں جھانکنے کی لچک اور قابلیت رکھتا ہو۔

ساتواں یہ ہے کہ علامتوں اور استعاروں کی ذریعے تخلیق کار کے مابعد الطبیعاتی سٹرکچر تک پہنچنے کا خواہشمند ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی تعبیر کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔

آٹھواں اصول یہ ہے کہ نقاد نظام فطرت کا فہم رکھتا ہو اور اس میں دلچسپی لیتا ہو تا کہ کسی بھی تخلیق کے بطن کو انسانی فطرت کے تناظر میں دیکھ سکے۔

نواں اصول کہ تخلیق کو تفہیم و تعبیر کی نیت سے دیکھے اور اس پر کسی قسم کے حتمی فیصلے کو مسلط کرنے کے بجائے اپنی رائے دینے تک محدود رہے۔

دسواں اصول یہ ہے کہ نقاد ایک سے زیادہ علوم و نظریات سے واقفیت رکھتا ہو اور ادب کے علاوہ صناعی، قدرت اور دیگر فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور مصوری وغیرہ سے لطف لینے کے مزاج اور صلاحیت کا حامل ہو۔

گیارہواں اصول سب سے اہم ہے کہ نقاد داخلی اور خارجی ادب میں فرق کر سکتا ہو۔ اگرچہ خارجی ادب میں بھی زبان، کرافٹ، نثری آہنگ اور بحور کے مترنم ہونے کو ستائش کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن اسے داخلی ادب کے مقابلے میں ہرگز نہیں رکھا جا سکتا۔

بارہواں اصول یہ ہے کہ اگر تخلیق کار اعلیٰ فکر اور نظریے کو بھرپور شعریت اور جذبے کے ساتھ شاعری میں یا اور تخنیلیٹی کے ساتھ کرداروں یا پراثر واقعات کے ساتھ پیرا ہن تخلیق میں لانے اور قاری کو متاثر کرنے میں

کامیاب ہوجاتا ہے تو نقاد کو چاہیے کہ ایسے تخلیق کاروں کو پوری کشادہ دلی کے ساتھ قبول بھی کرے اور ان کی تعریف و توصیف کرنے سے ذرا جھجک محسوس نہ کرے۔

اسی ضمن میں کتنے ہی اصول بین السطور بھی بتا دیئے گئے ہیں تا کہ صاحبان عقل و دانش ان کو سمجھ کر ان سے کما حقہ استفادہ کر سکیں۔

کارگاہِ عمل تخلیق

سائنسیت کی تمام تر کوششوں کے باوجود ابھی تک شاعری کی طرح کسی بھی تخلیقی کام کے بارے کوئی حتمی فارمولا وضع نہیں کیا جاسکا کہ انسانی ذہن کا کونسا حصہ تخلیقی کام کیسے کب اور کیوں سرانجام دیتا ہے یا تخلیقی نظام کیا ہے؟ کیسا ہے؟ یا کس طرح کا ہونا چاہیے؟ کیونکہ ہر انسان کا باطنی نظام یقیناً دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر تخلیق کار کا باطنی یا مابعد الطبیعاتی تخلیقی تانہ بانہ بھی مختلف ہوگا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہر تخلیق کا مابعد الطبیعاتی تانہ بانہ ایک دوسری سے مختلف ہو۔ مثال ہے کہ ایک ہی شخص اگر ایکبار کسی نشے کی حالت میں شعر کہے اور دوسری بار ہوش و حواس میں رہ کر تخلیق کرے تو اس کی تخلیقی کیمسٹری تبدیل ہوجائے گی اور یہی تبدیلی اس کے دونوں تخلیقات کا باطنی یا مابعد الطبیعاتی تانہ بانہ بدل دے گی اس لیے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ تخلیقی اظہار کا کوئی داخلی فرما یا فارمولا وضع کیا جاسکے لیکن پھر بھی میڈیم، اصناف یا اوزان اور بحور کی طرح کچھ خارجی پیٹرنز ایسے ضرور ہیں جو تخلیق کو خارجی تشکیل کی سہولت فراہم کرتے ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ خیال کی کوئی اپنی زبان ہے اور ابھی تک دنیا کا کوئی بھی علم اس کا وقوف حاصل نہیں کر سکا کیونکہ انسان کے پاس پہلے سے موجود رسائی کے تمام طریقے خارجی ہیں جبکہ خیال کی زبان داخلی ہے جسے خارج تک لانے کے لیے خود ذہن کو خارجی پیمانوں میں تبدیل کرنا پڑتا ہے لہٰذا زبان، رنگ، تصویر، اشارے یا ایکسپریشنز ایسے خارجی پیمانے ہیں جو خود سے کچھ نہیں کر سکتے جب تک انسانی ذہن ان کو خیال کی ٹرانسلیشن کا حکم نہ دے۔ ذہنی کیفیات کا بہاؤ اور ٹکراؤ خیال کے ساتھ تعامل سے تخلیقی عمل کو متحرک کرتا ہے۔ کبھی یہ اچانک ہوتا ہے اور کبھی پکتا رہتا ہے اور کچھ مدت بعد وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل ایک ایسا پراسرار نظام ہے جس کا قاعدہ کلیہ اگر کوئی ہے بھی تو اس کے سرے اتنے زیادہ ہیں کہ ایک کو تھامیں تو دوسرا ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ کبھی مدتوں بھٹکتے پھرتے خیال کسی خاص کیفیت کا دامن تھام کر اظہار کے خارجی پیمانہ منتخب کرتے ہیں اور پورے وفور سے ظہور پانے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں اور کبھی اچانک وارد ہونے والی کیفیت خیال

کا ہاتھ پکڑ کر لفظوں، سُروں یا رنگوں میں ڈھل جاتی ہے۔ داخلی اور خارجی، مابعدالطبیعاتی اور طبیعاتی دونوں سطحوں پر جب ایک تخلیق کار کو اپنے تخلیق کار ہونے کا احساس ہوتا ہے تو داخلی ریاضت کا موقع اس کی نفسی صورتحال فراہم کرتی ہے جبکہ خارجی ریاضت اسے شعوری کوشش سے جاری رکھنا پڑتی ہے۔ یوں کوئی انسان اپنی ذات میں ایک کارگاہِ تخلیق کا قیام عمل میں لاتا ہے اور اس کے اندر ایک پیچیدا نظام مربوط اور واضح ثمرات دینا شروع کرتا ہے۔ ماہرین نفسیات کو تخلیقی عمل تک پہنچنے میں اتنی کامیابی ضرور ملی ہے کہ وہ خیال کی زمین میں ہل چلانے اور اس کے بعد ذہن کو آزاد چھوڑنے کے بعد آمد کے ظہور تک انتظار کے عمل اور پھر تخلیق کے وقوع پذیر ہونے کو ثابت کر چکے ہیں جس کی گواہی تخلیق کاروں کی اکثریت دیتی ہے۔ اس تمام بحث کا مقصد دراصل کارگاہِ عمل تخلیق کو سمجھنے کی بحث کا آغاز کرنا ہے اور یہ مرحلہ تخلیقی مختلف تخلیق کاروں سے مکالمے اور تخلیقی واردات کا پیچھا کیے بغیر ممکن نہیں کیونکہ سائنسدان اس میں مکمل طور پر ناکام ہو کر اب اس کا قلع قمع کرنے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔

اس مابعدالطبیعاتی تانے بانے کے متوازی ایک خارجی اور شعوری تانہ بانہ بھی موجود ہے جس میں داخلی احساساتی اور کیفیاتی نظام نہ ہونے کے برابر اور خارجی مشق و ریاضت کا نظام بھرپور طور پر کارفرما نظر آتا ہے۔ تکرار یا مشق ایک ایسا خارجی عمل ہے جس کے نتیجے میں ذہنی و جسمانی مہارتیں حاصل ہوتی ہیں۔ فنون لطیفہ میں بھی خیالات کو خوبصورت یا منظم پیرایۂ اظہار دینے کے لیے خارجی وسیلوں کی مشق کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مہارت کو ہنر کا نام دیا جاتا ہے۔ جہاں تخلیق اور ہنر اکٹھے ہو جائیں معیاری کام سامنے آتا ہے۔ اگرچہ ہنرمند فنکار بھی تخلیق کار ہی کہلانا پسند کرتے ہیں لیکن وہ ہوتے ہیں کیونکہ تخلیقی عنصر کے بغیر ہنر ایک خوشکل لیکن بے روح وجود کی طرح ہوتا ہے جبکہ بغیر مشق و مہارت کے بھی بڑی تخلیقات ریکارڈ پر موجود ہیں جسے تخلیق کاروں نے اوائلِ عمری میں بغیر کسی مہارت کے تخلیق کیا اور وہ شاہکار قرار دی گئیں۔ ہنرمند اور مشاق فنکار سامنے کے خیالات اور موضوعات یا اشکال کو کرافٹ اور سکلز کی بنیاد پر شعر، تصویر یا گیت کی شکل میں ڈھالتے ہیں۔ مثال کے طور ایک مصور اپنی وحشت یا بے چینی کی پینٹنگ بناتا ہے دوسرا کیمرے سے کھینچی گئی فوٹو کو سامنے رکھ کر برش اور رنگوں کی مدد سے پورٹریٹ بنا دیتا ہے۔ یا شاعر کسی موضوع پر منظوم اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ نظریاتی شعراء بھی اکثر اپنی فکر کو پرشکوہ لفظوں کی مدد

سے مترنم بحروں میں منظوم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور داد بھی پاتے ہیں لیکن ان کی شاعری ذہن کو تو متاثر کرتی ہے لیکن دل کو چھونے میں ناکام رہتی ہے۔ کئی کلاسیکل گائیکوں کے ہاں بھی یہی صورتحال نظر آتی ہے کہ وہ کسی بھی راگ کو پورے قواعد وضوابط کیساتھ گانے کے باوجود سننے والے کو متاثر نہیں کرتے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر ناقدین خارجی مہارتوں پر گرفت رکھنے والے تخلیق کاروں کی شان میں زمین آسمان کے کلابے ملا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ خود ان کا تخلیقی گداز اور سوز سے محروم ہونا ہے۔ وہ ہمیشہ واہ کو ہائے پر فوقیت دیتے ہیں کیونکہ خود ان کے اپنے اندر ہائے کا میکنزم یا تو ہوتا نہیں یا بہت سطحی ہوتا ہے۔

اب فنکاروں کی ایک کلاس اور بھی ہے جو تخلیق کار نہیں بلکہ صرف اچھے نقال ہوتے ہیں۔ خیال کسی کا، زمین کسی کی، اسلوب کسی کا۔ کوئی ٹوٹا کہیں سے اٹھایا کوئی کہیں سے۔ دبا کے مارکیٹنگ کی، پبلک ریلیشننگ آزمائی اور سکہ رائج الوقت کہلائے۔ ادراکی تنقید کا بنیادی فلسفہ ہی اس تفریق کو واضح طور پر بیان کرنا ہے تاکہ تخلیق جیسے مقدس انسانی عمل کو سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہ رہ جائے۔

ادراکی تنقید کا دائرۂ کار

ادراکی تنقید محض کسی تخلیق کار کے نظامِ تخلیق، عملِ تخلیق اور تخلیق کی تفہیم وتعبیر ہی کا کام ہی سرانجام نہیں دیتی بلکہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان ادراک کی تعلق کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔

دنیا کے تمام علوم، معلومات اور تعلیم کی طرح محسوسات وکیفیات کے وقوف اور اس کے معانی کا سارا انحصار ادارک پر ہے۔ گویا خارج اور انسانی ذہن کے درمیان ادراک ہی وہ پل ہے جس پر انسان، زندگی اور انسانی کائنات قائم ہے۔ یقیناً ادراک کی صفت حیوانوں بلکہ تمام جانداروں میں بھی موجود ہے جس کے باعث وہ اپنے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے درختوں اور پودوں میں پھولوں اور پتوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں کا ہونا ان کے بیرونی خطرات کے ادراک سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہاں ایک بات اور بھی سمجھ آتی ہے کہ ادراک بھوک، پیاس اور جنس کی طرح جبلی ہے اور اگر اسے جبلی خصائص میں شمار کیا جائے تو ایسا غلط بھی نہیں ہوگا۔ لیکن انسانی ذہن کو دیگر جانداروں کی نسبت جو ادراک حاصل ہے وہ ایک وسیع وعریض اور شش جہات جہان کی طرح کا ہے جس کی وسعت، گہرائی اور بلندی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہی خوبی کیا کم ہے کہ ہر انسان کے ادراک کی ماہیت آنکھ کی پتلی اور انگوٹھے کے نشان کی طرح دوسرے سے مختلف ہے۔ یعنی بظاہر ایک جیسے ہو کے بھی مختلف انفرادی

علامتی نشان ہونا یقیناً ایک غیر معمولی مظہر ہے۔ بالکل ایسے ہی ہمیں دنیا بھر کے انسانوں میں ذہنی اعمال کی شدت کی انفرادیت کے باوجود مماثلت بھی نظر آتی ہے۔ لاتعداد خارجی عوامل میں انسانوں کا تجربہ اور ردعمل ایک جیسا ہوتا ہے جیسے آگ سے جلنے اور سردی سے ٹھٹھرنے کا تجربہ اور اس پہ ردعمل۔ یہی نکتہ ادراکی تنقید کو شعرا کی تخلیقات اور اس پر مماثل ردعمل کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس مماثل ردعمل کے مطالعے کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ مثال کے طور پر خوشی کی کیفیت میں کہی گئی نظم اور رنج والم کی کیفیت میں کہی گئی نظم کس طرح الگ الگ کیفیات کی ترسیل پر قادر ہوتی ہیں؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان ادراکی ہم آہنگی کا رشتہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غم، محبت اور نفرت، غصہ اور غم انسانی جبلتیں ہیں اور داخلی مہیجات کے ساتھ ساتھ خارجی مہیجات کے ردعمل میں بھی پیدا ہوتی ہیں لہٰذا جہاں جہاں تخلیق کار اور قاری کے خارجی تجربات یا مہیجات میں مماثلت ہوتی ہے وہاں وہاں ان کا ردعمل بھی مماثل ہوتا جاتا ہے۔ تخلیق کار کا معاشرتی مشاہدہ اور احساس مشاہدہ جتنا اجتماعی سطح پر وسیع ہوگا اور اس کے تخلیقی تجربے کا جس تخلیقی طاقت سے حصہ بن پائے گا اس کی اثر پذیری اتنی آفاقی ہوتی جائے گی اور جتنا یہ عمل جبلی سطح سے نکل کر فکری اور نظریاتی بنیادوں پر استوار ہوگا اتنا ہی فکری اور نظریاتی ہم آہنگی یا مماثل تجربہ یا فکر رکھنے والے قاری تک ابلاغ کے زینے طے کرے گی۔ رومانی اور ترقی پسند ادب، ادیب اور ان کے قاری کے درمیان تعلق کی مثال اس مدعے کی مزید وضاحت کو آسان بنا دیتی ہے۔ لیکن یہ معاملہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان صرف ذاتی اور سماجی ادراک کی مماثلت پر ہی موقوف نہیں بلکہ تخلیق کار کی تخلیقی قابلیت اور قاری کے اس تخلیق پارے کے احساساتی اور نظریاتی ادراک پر بھی منحصر ہے۔ اس میں ادراکی تنقید کے لیے یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اس بات کی پرکھ کرے کہ کیا فکری اور نظریاتی اظہار کیا صرف سوچ کی حد تک ہی قاری تک پہنچا ہے یا ایسی تاثیر سے پہنچا ہے کہ وہ قاری کو ذہنی و قلبی سطح پر کہیں تحریک دینے یا اس کی ذات کا حصہ بننے میں بھی کامیاب ہوا ہے۔

ادراکی تنقید تخلیق کار اور اس کے قاری کے درمیان تعلق کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کس سطح کا ہے؟ اور کتنا مضبوط اور کتنا پائیدار ہے؟ جیسے سوالات کے جواب ڈھونڈتی ہے کیونکہ اسی سے تخلیق کار کے مقام و مرتبے کا تعین ممکن ہے نہ کہ محض لسانی مہارت اور فنی چابکدستی سے۔

☆☆☆☆☆

کثیر الجہت شخصیت صفدر ہمدانی کی ادب کہانی [بقیہ حصہ]

اس گھر پہ ختم ختمِ نبوت کا سلسلہ
حیَّ الالفلاح کا ہے سلسلہ حسین
چاروں طرف سے گریہ و ماتم کی تھی صدا
بعد از درود قبر میں جونہی پڑھا حسین
شعروں کو میرے سوزِ سکینہ عطا ہوا
مصرعوں کو تونے لہجہء میثم دیا حسین
سر کو کٹا کے نیزے پہ معراج پا گیا
معلوم بس خدا کو تیرا مرتبہ حسین
گردش میں میرے خون کی شامل علی کا نام
میرے روئیں روئیں میں فقط ہے بسا حسین
تاحشر ہر زمانے کے ہر اک یزید کو
بیعت سے تونے کر دیا نا آشنا حسین
تقلید میں یزید کی ہر بے ضمیر ہے
روشن ضمیر لوگوں کا نعرہ بنا حسین
اُسوقت بھی فرشتوں کی آنکھوں میں اشک تھے
تخلیق کر رہا تھا تجھے جب خدا حسین
ایسا لگا کہ رحمتِ ہزداں میں آ گئے
سر پر ہمارے جب ترا پرچم کھلا حسین
بے شک یہی ستون ہیں ہر کائنات کے
حیدر، بتول ، شاہ حسن، مصطفیٰ ، حسین
ہر بے ضمیر اہل قلم کے لیے پیام
تم کو یزید مل گیا مجھکو ملا حسین
صفدر قسم خدا کی یہ ایمان ہے میرا
اللہ کا دیا ترے در سے ملا حسین

.....

قائم ہے اپنی آخرت نام حسین پر
صدیوں کی یہ مسافرت نام حسین پر
صفدر حسین عشق و محبت کا نام ہے
پھیلاؤ مت منافرت نام حسین پر

.....

ہر ایک غم سے فزوں تر حسین کا غم ہے
ازل سے تا دمِ محشر حسین کا غم ہے
نبی کی آل کے غم پہ ہمارے غم ہیں نثار
ہمارے درد کا محور حسین کا غم ہے
یہ دل کی دھڑکنیں کہتی ہیں ہائے ہائے حسین
یہ آنسوؤں کا سمندر حسین کا غم ہے
اس ایک غم پہ کسی کی اجارہ داری نہیں
ہر ایک روح کے اندر حسین کا غم ہے
شفق پہ یہ جو ہے سرخی غمِ حسین کی ہے
غروب شمس کا منظر حسین کا غم ہے

ظفر معین بلے جعفری

نبی سے عشق ہو لیکن غم حسین نہ ہو
سنو رضائے پیمبر حسین کا غم ہے
اثاثہ ہے میرے بچوں کا غم یہی صفدر
بمثلِ شجرِ تناور حسین کا غم ہے

.....

خنجر تلے جو اوج عبادت تھا وہ حسین
لُٹوا کے گھر نشان ہدایت تھا وہ حسین
سردار خُلد کا ہے وہ بھائی حسن کے ساتھ
مثل رسول تاج شفاعت تھا وہ حسین
مظلومیت کو جسکی ضرورت ہے آج بھی
پہلے بھی دین حق کی ضرورت تھا وہ حسین
جس نے بدل دیئے ہیں معانی شکست کے
جو کربلا میں رمز مشیت تھا وہ حسین
علم علی وجود کا اُسکے لباس تھا
اللہ کے نبی کی طبیعت تھا وہ حسین
راہ خدا میں دے دیا اصغر سا شیر خوار
بے شک کمال صبر کی آیت تھا وہ حسین
برچھی نکالی سینے سے کڑیل جوان کے
خیبر شکن علی کی جو طاقت تھا وہ حسین
عباس جیسا بھائی بھی قربان کر دیا
ہر رُخ سے کوہ عزم وصداقت تھا وہ حسین
ٹکڑے اُٹھا کے لائے وہ قاسم کی لاش کے
ہر ایک رُخ سے شان امامت تھا وہ حسین
جس نے یزیدیت کو کچل ڈالا پاؤں میں
بے شک دلیل ختم نبوت تھا وہ حسین
جس کو رسول نے کہا قلب ونظر کا چین
کرب و بلا میں حفظ شریعت تھا وہ حسین
جس کے گلے پہ دیتے تھے بوسہ رسول پاک
نوک سناں پہ محو تلاوت تھا وہ حسین
نام یزید جس نے مٹا ڈالا حشر تک
صفدر خدا کے دین کی قسمت تھا وہ حسین

صفدر ہمدانی

جنت میں اضطراب ہے روحِ بتول کو
سجدے میں قتل کردیا نفس رسول کو
لاشِ علی جو قبر میں صفدر اُتار دی
اُمت نے دفن کر دیا حق و اصول کو

صفدر ہمدانی

پانچ مختلف سلاموں سے پانچ منتخب اشعار:

در شان شہزادہ علی اصغر

چھ ماہ کے شہید کا حملہ عجیب تھا
اصغر نے مسکرا کے یزیدوں کو دی شکست

.....

سوکھے لبوں سے وار کیا ہنس کے اس طرح
اصغر نے رکھ دیئے سبھی کس بل نکال کر

.....

اصغر کے حلق پر جونہی تیر ستم لگا
آئی ندا کہ سورۂ کوثر ہوا شہید

.....

عجیب شان کا چھ ماہ کا سپاہی تھا
گلے کی ڈھال سے روکا تھا حرملہ کا تیر

.....

اکیسویں صدی میں محترم صفدر ہمدانی ادبی سٹیج پر چوکے اور چھکے مارتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کا جوش و جذبہ ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ بیک وقت بہت سے محاذوں پر

اپنے قلمی اور فکری جوہر دکھا رہے ہیں۔ ان کی تخلیق اور تحقیق کے رنگ دیدنی ہیں۔ کچھ کتابیں ترتیب دے چکے ہیں لیکن ابھی وہ کاغذی پیرہن میں منظر عام پر نہیں آئیں لیکن جو کتابیں ابھی پردۂ اخفا میں ہیں، ان کی بھی، ابھی سے دھوم مچی ہوئی ہے۔ شاید اس لئے کہ ان کی جھلکیاں اہل ادب نے دیکھ لی ہیں یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے عنوانات دیکھ کر ان کے مندرجات کا اندازہ لگا لیا گیا ہو۔ اس حوالے سے بعد میں بات ہوگی کیونکہ میں پہلے ان کی سفر نامہ نگاری پر چند سطریں لکھنا چاہتا ہوں۔ محترم صفدر ہمدانی صاحب کے اندر ایک دیدہ ور سیاح اور ایک صاحب نظر سفر نامہ نگار بھی چھپا ہوا ہے۔ وہ انہیں دیس دیس گھومنے پھرنے اور وہاں کی مخفی رعنائیوں کا کھوج لگانے پر اکساتا رہتا ہے اور یہ اپنے دامان نظر میں تمام خوبصورت مناظر کو محفوظ کرنے کے بعد اپنے قلم کو محسوسات کی روشنائی میں ڈبو کر سپرد قرطاس کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ان کا انوکھا زاویہ نگاہ اور منفرد اسلوب نگارش سفر نامے کو نئی جہت عطا کرتا ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ انھوں نے جو پہلا سفر نامہ لکھا اور اسے کتابی شکل دی، کیا اس کے عنوان ہی میں وہ سب کچھ نہیں ہے، جس کی نشان دہی میں نے ان کی سفر نگاری کے حوالے سے مندرجہ بالا سطور میں کی ہے۔ "تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا" ان کا یہ پہلا سفر نامہ اگست 2006 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر بازارِ ادب میں آیا تھا۔ اس کتاب میں سفر نامہ نگار کا منفرد زاویہ ء نگاہ دامنِ نگاہ کو اپنی طرف کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پاکستانی نژاد محترم صفدر ہمدانی نے ملک ملک کی سیر کی ہے۔ ایران، جاپان، نیدرلینڈ، ہیگ، ایمسٹرڈیم، جرمنی، برلن، فشیہ، سٹٹگارٹ، فرانس، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، یونان، دبئی، ترکی، بلجیم، امریکہ، کینیڈا، شام، مصر، فن لینڈ اور آسٹریلیا آسٹریا، ویانا اور کویت جا کر سیر و سیاحت کے مزے لوٹتے رہے ہیں۔ ملکوں اور معروف شہروں کی یہ فہرست بڑی لمبی ہے، اسی لئے میں نے کچھ اہم نام بھی حذف کر دیئے ہیں۔ جہاں جہاں بھی گئے، وہاں کے تاریخی، روحانی اور جغرافیائی پس منظر اور پیش منظر کو بھی اپنی نگارشات میں اجاگر کرتے رہے۔ دیس دیس کے شہر شہر میں مرثیہ خوانی کا اعزاز بھی اپنے نام کیا اور وہاں کے مکینوں کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑ کر واپس آئے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا، اپنے وطن ثانی واپسی پر سفر نامے لکھ کر ان کی جھلکیاں اخبارات و جرائد کے قارئین کرام کو بھی دکھائیں۔ غیر ملکی دوروں کے دوران مناقب و سلام کا سلسلہ بھی ان کیساتھ ساتھ چلتا رہا ہے۔ گویا ان کے اندر کا مرثیہ نگار ہمیشہ بیدار رہا۔ کوتاہی ہوگی کہ ان کی

مرثیہ نگاری کی بات ہو رہی ہے اور ان کے ان دو مجموعوں کا ذکر نہ کیا جائے جو ان کی عظمت و مرتبت میں اضافے کا باعث بنے۔ ان میں ایک ہے زینتِ ہستی اور دوسری کتاب کا نام ہے عطائے رضا۔ زینتِ ہستی ایک ایسا مرثیہ ہے جو ماں کے موضوع پر لکھا گیا اور یہ کتابی صورت میں 2007 میں منصۂ اشاعت پر جلوہ گر ہوا۔ جبکہ "عطائے رضا" کا عنوان ہی بتا رہا ہے کہ یہ مرثیہ امام رضا علیہ السلام کیلئے ہے۔ یہ دونوں کتابیں انھوں نے اپنے اشکوں سے لکھی ہیں۔ الفاظ درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لہجے میں گداز ہے۔ قیامت خیز احساسات کو انھوں نے جو پیرایۂ بیان عطا کیا ہے، وہ انہی کا خاصا ہے۔ اور سننے والوں کو اپنے دل کے اندر اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے شاہکار مرثیوں کا ایک مجموعہ "رو رہا ہے آسمان" زیرِ ترتیب ہے۔ اس زیرِ ترتیب کتاب کا کچھ کلام بہت سیارباب علم و ادب سن چکے ہیں، اسی لئے انہیں اس کی اشاعت کا شدت سے انتظار ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ، وہ رو رہا ہے آسمان سامنے لاکر ہمیں کب رُلاتے ہیں۔

محترم صفدر ہمدانی نظم اور غزل دونوں کے منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ غزل کہیں تو لگتا ہے کہ یہی ان کا میدان ہے اور نظم نگاری میں اپنے تخلیقی اور فکری جوہر دکھائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے اسی کام کیلئے انہیں زندگی بخشی ہے۔ انھوں نے گل و بلبل کی شاعری نہیں کی، تازہ کاری، سادگی، مضمون آفرینی اور پُرکاری سے اپنی شعری نگارشات کو دلکشی عطا کی ہے۔ ان کی کتابوں کے عنوانات بھی ان کی ندرتِ فکری کی خبر دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔ ایک کا نام ہے "بادل۔ چاند اور میں" اور اپنی غزلوں کے دوسرے مجموعے کو انھوں نے "گونگی آنکھیں" قرار دیا ہے۔

محترم صفدر ہمدانی کا ادبی سفر جاری ہے۔ اس لئے ان کے کام کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو کلام ان کی تمام شاہکار کتابوں یا زیرِ ترتیب کتابوں میں شامل نہیں، وہ میری دسترس سے دور ہیں۔ اسی لئے ان کی دستیاب کتابوں سے میں نے ان کا تھوڑا سا کلام آپ کی ضیافتِ طبع کیلئے منتخب کیا ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ انھوں نے نظم اور غزل دونوں شعری اصناف میں بڑی خوبصورت شاعری کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے محترم صفدر ہمدانی کا انتخابِ کلام۔

آغاز نئے سال کا تنہا ہی کیا ہے\
اس عشق نے سید کو بھی رسوا ہی کیا ہے\
میں نے تو ہر اک درد کو پوشیدہ ہی رکھا\
اور تم نے ہر اک درد کا چرچا ہی کیا ہے\
میں نے جو کیا اسکا نتیجہ تھا لاحاصل\
جو کچھ بھی کیا تم نے وہ اچھا ہی کیا ہے\
اظہار محبت کے لئے منتظر موت\
ان خون کے رشتوں نے تو ایسا ہی کیا ہے

زندہ تھے جو وہ مر گئے اس عشق کے ہاتھوں
مرنے کے طلبگاروں کو زندہ ہی کیا ہے
دروازہ مقفل ہے کئی برسوں سے لیکن
دستک پہ ہر اک دل ہے کہ تڑپا ہی کیا ہے
صفدر ہے تجارت سے شغف اُسکا پرانا
اُس نے تو محبت کا بھی سودا ہی کیا ہے
صفدر ہمدانی

حاصل دوام کب ہے بھلا اب دوام کو
ہم کہ ترستے رہتے ہیں انکے سلام کو
نیلام ہو رہا ہے ادب بھی ادیب بھی
پھیلائیں شہر شہر میں اب اس پیام کو
تلوار کا وجود ہے تلوار زن کے ساتھ
معیار مت بنایئے خالی نیام کو
بے شک یہ ہونے غالب دوراں کہیں تمہیں
میں جانتا ہوں خوب تمہارے مقام کو
پہنچی ہے اب ضمیر فروشی عروج پر
جی چاہتا ہے آگ لگا دوں کلام کو
مفتی ادب کے دین کے مفتی سے کب الگ
کیسے حلال کرنے لگے ہیں حرام کو
عاری جو عدل سے ہو عدالت سے دور ہو
دوزخ رسید کیجئے ایسے امام کو
اعزاز اب ادب کا نہیں چاہیے مجھے
رکھیئے معاف بہر خدا اس غلام کو
اب نام پر ادب کے تجارت ادب کی ہے
صفدر ہوا نہ دیجئے گا انتقام کو

.....

ایسے مجھ میں وہ دیدہ ور زندہ
قلب طوفاں میں جوں بھنور زندہ
زندگی تیری تلخیوں کے طفیل
مر کے بھی زہر کا اثر زندہ
ہے کمال عروج دست ہنر
مر گیا باہنر، ہنر زندہ
مجھ میں تیرے وجود کا اعجاز
شب ہے زندہ مری سحر زندہ
ہو چکا ہے سفر اگرچہ تمام
دل میں ہے خواہش سفر زندہ
عہد امروز کی مثال ہے یہ
مردہ دیوار میں ہے در زندہ
تو مصور ہے تو مجھے بھی کبھی
اپنے اس کینوس پہ کر زندہ
پھر میں مانوں تجھے خدا اپنا
تو کرے مار کر اگر زندہ
نوک نیزہ پہ کر دیا ہے بلند
پھر بھی صفدر مرا ہے سر زندہ

.....

قتل بھی وہ ہی مجھکو کرتا ہے
وہ جو مجھ بے ہنر پہ مرتا ہے
زندگی بھر کا تجربہ ہے یہی
سب سے سستا ضمیر بکتا ہے
نام خط میں نہیں کسی کا مگر
خط مجھے روز کوئی لکھتا ہے
اسکے گھر کے ہزار رستے ہیں
میرے گھر کا بس ایک رستہ ہے
دل ہی مجھ سے سوال کرتا ہے
دل سمندر میں کون بستا ہے

وہ بھی عقرب ہے میں بھی عقرب ہوں
وہ محبت میں بھی تو ڈستا ہے
میں نے صفدر تمام عمر لکھا
اسقدر سچ کہ جھوٹ لگتا ہے

.....

قائم لہو کی سرخی مگر چہرہ زرد ہے
سارا بدن سفر میں میرا گرد گرد ہے
وہ جب گلے ملا تو یہ کہنا پڑا مجھے
بے شک ہے ہاتھ گرم مگر لہجہ سرد ہے
فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی اک لاش کا سوال
کیا شہر میں تمہارے کوئی ایک مرد ہے
اک روز بھی تو اسکی کسک کم نہیں ہوئی
سینے میں اس فقیر کے یہ کیسا درد ہے
صفدر جو سر جھکا کے کئی سال تک ملا
وہ بھی منافقوں کے قبیلے کا فرد ہے

.....

اب گرچہ نہیں اُس سے ملاقات مسلسل
برسوں سے تسلسل میں ہے وہ رات مسلسل
حیران ہوں کیوں اتنا مجھے چاہا ہے تم نے
دوہراتی رہی وہ یہی اک بات مسلسل
ہے آج بھی تنہائی مری ذات کا حصہ
اس لمحے تلک ہیں وہی حالات مسلسل
بچھڑے ہوئے اُس شخص کو گزرا ہے زمانہ
اب بھی ہیں مگر اُسکی عنایات مسلسل
وعدہ تھا جدا ہوتے ہوئے رونا نہیں ہے
رہتی ہے مگر آنکھوں میں برسات مسلسل
کچھ درد ہے کچھ آہیں تو کچھ اشک سُلگتے
ملتی ہے ترے نام پہ سوغات مسلسل

جس ہات کو صفدر کبھی اُس شخص نے چوما
خوشبو سے معطر ہے وہی ہات مسلسل

.....

مجھکو اکیلا کر کے بھی تنہا نہیں کہا
اپنا سمجھ لیا مگر اپنا نہیں کہا
بے شک بنایا اس نے ہدف مجھکو رات دن
جیسا مجھے کہا اُسے ویسا نہیں کہا
راہ حیات میں کئی چہرے حسیں ملے
جو کوئی بھی ملا اُسے تم سا نہیں کہا
شکر خدا کا درس دیا ماں نے اسطرح
حالات بد پہ بھی کبھی نوحہ نہیں کہا
شطرنج کی بساط پہ کھا کر شکست بھی
بس تھا قصوروار پیادہ نہیں کہا
اک پیاس تھی اُگی ہوئی ساحل کی ریت میں
تشنہ لبی کی حد ہے کہ پیاسا نہیں کہا
صفدر یہ میرا ظرف ہے اپنے غنیم کو
دشنام بھی نہ دی اگر اچھا نہیں کہا

.....

اور آخر میں صفدر ہمدانی کا یہ ایک قطعہ بطور خاص کہ یہ دو شعر انکی قلمی، فکری، سماجی، سیاسی اور ادبی زندگی کے غماز ہیں اور ان دونوں اشعار میں انکا مزاج اور فلسفہ صاف صاف نظر آتا ہے:

حیات ساری میری عشق میں ہوئی ہے بسر
کٹے گا عشق میں باقی جو رہ گیا ہے سفر
گزر گئے ہیں بہتر برس مرے صفدر
کسی یزید کے آگے نہیں جھکا یہ سر

☆☆☆☆☆

احمد ندیم قاسمی ایک بلند پایہ نعت گو

علی رضا

احمد ندیم قاسمی ایک اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار، توانا لہجے کے شاعر، بہترین کالم نویس اور صاحبِ طرز ادیب و دانشور تھے لیکن جو بات انہیں دوسرے بہت سے قلم کاروں سے ممتاز کرتی تھی وہ اُن کے شخصی اوصاف کا حُسن تھا جس نے اُن کے ہر پہلو کو دیدہ زیب بنا دیا تھا قُدرت نے اُن کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع کر دی تھیں جن کی بنا پر وہ ادب کی غیر معمولی شخصیت اور افقِ شعر و نثر کا ایک درخشندہ اور تابندہ ستارہ بن کر ہمیشہ سخن وادی میں اپنی روشنیاں بکھیرتے رہے اپنی زندگی میں جہاں اُنھوں نے بہت سا تخلیقی کام کیا اور

شاعری کی تمام اصناف میں خوبصورت انداز میں میدان علم وفن کی آبیاری کی وہاں خصوصاً نعتیہ شعری تخلیق کے حوالے سے بھی انتہائی عمدہ کام شائقین شعروادب کی نذر کیا---------

نعتیہ تخلیق کا ہنر نہ جانے اُن کے باطن کو کب سے روشن کیے ہوئے تھا اور عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سمندر اُن کے رگ و پے میں کب سے ٹھاٹھیں مارنے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے تھا--اپنی نظم ونثر کو فنی بلندیوں تک پہنچانے والے اس تخلیق کار نے جب نعت کہی تو منفرد اور اُچھوتی------ اُن کے ہاں عشقِ نبیؐ اور محبت رسولؐ کا رسمی اور سطحی پیرایہ نہیں ملتا بلکہ اُنھوں نے اس متبرک اور مقدس عمل کو نہایت ادب اور احترام سے ماحول کے خوبصورت سانچے میں ڈھال کر اس سے کسبِ فیض کرنے اور اُس کی روحانیت سے دامنِ مراد بھرنے کے لیے ہمہ وقت خود کو وقف کر دیا تھا--------

اُن کا بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھیک مانگنے کا انداز بھی دیکھیں ---------

مجھے تو اپنے کرم کی یہیں بشارت دے
کہ روزِ حشر نہ دیتا پھروں دہائی تری

درونِ سینہ مدینہ اُٹھائے پھرتا ہوں
کہ ایک پل بھی گوارا نہیں جدائی تری

اُن کی نعت میں بہار ہی بہار ہے خزاں رسیدگی نام کو نہیں ہے فضائے سخن میں اُن کے نعتیہ پھولوں کی مہک نے ایک جہانِ معنی آباد کر رکھا ہے ایسا جہان جس میں مختلف النوع خوشبوئیں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں جنھوں نے تمام فضا کو معطر اور معنبر کر دیا ہے اُن کے چند اشعار جو ان کی فنی پختگی اور شعری انفرادیت کے مظہر بنے نذرِ قارئین ہیں---

میں کہ بے وقعت و بے مایہ ہوں
تیری محفل میں چلا آیا ہوں

یہ کہیں خامیء ایماں ہی نہ ہو
میں مدینے سے پلٹ آیا ہوں

.....

اس قدر کون محبت کا صلہ دیتا ہے
اس کا بندہ ہوں جو بندے کو خدا دیتا ہے

اس کی رحمت کی بھلا آخری حد کیا ہوگی
دوست کی طرح جو دشمن کو دعا دیتا ہے

.....

راہ گم کردہ مسافر کا نگہبان تو ہے
اُفقِ جاں پہ مثالِ مہِ تاباں تو ہے

میرے نقاد کو شاید ابھی معلوم نہیں
میرا ایماں ہے مکمل مرا ایماں تو ہے

.....

احمد ندیم قاسمی کی بعض نعتوں کو بین الاقوامی

سطح پر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اُن کی مقبول اور معروف نعتوں کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔۔۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اِس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

دل میں اترتے حرف سے مجھ کو ملا پتہ ترا
معجزہ حُسنِ صوت کا زمزمہ صدا ترا

میرا تو کائنات میں تیرے سوا کوئی نہیں
ارض تری، سما ترے، بندے ترے خدا ترا

اے مرے شاہِ شرق و غرب نانِ جویں غذا تری
اے مرے بوریا نشیں سارا جہاں گدا ترا

.....

قطرہ مانگے جو کوئی تُو اُسے دریا دے دے
مجھ کو کچھ اور نہ دے اپنی تمنا دے دے

تیری رحمت کا یہ اعجاز نہیں تو کیا ہے
قدم اُٹھیں تو زمانہ مجھے رستہ دے دے

میں اس اعزاز کے لائق تو نہیں ہوں لیکن
مجھ کو ہمسائیگیء گنبدِ خضرا دے دے

میں تو تجھ سے فقط اک نقشِ کفِ پا چاہوں
تو جو چاہے تو مجھے جنت ماویٰ دے دے

.....

احمد ندیم قاسمی کا عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے چراغ کی مانند ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں پڑتی بلکہ اس کی روشنی کئی دوسرے جہانوں کو منور کرتی ہوئی نظر آتی ہے:

علاج گردشِ لیل و نہار تو نے کیا
غبارِ راہ کو چھو کر بہار تو نے کیا

کوئی نہ جن کی سُنے اُن کی بات تو نے سُنی
ملا نہ پیار جنھیں، اُن سے پیار تو نے کیا

.....

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستگی اُن کی زندگی کا حاصل ہے اور اُن کے لیے نجاتِ اخروی کا باعث بھی ہے اُنھیں اس پر فخر ہے:

مری حیات کا گر تجھ سے انتساب نہیں
تو پھر حیات سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں

ترا گدا ہوں اور اُس انجمن میں بیٹھا ہوں
جس انجمن میں سلاطیں بھی باریاب نہیں

ندیم پر ترے احساں ہیں اس قدر جن کا
کوئی شمار نہیں ہے، کوئی حساب نہیں

☆☆☆☆☆

بہرام باغپوری

ڈیئر بہرام باغپوری

اُمید ہے آپ اچھے سے ہوں گے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب آپ کا لکھا ہوا پڑھا کہ آپ کو بھی اس دور میں خط و کتابت کا سلسلہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میری پسندیدگی کی تو خیر بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ خط لکھنے والا اپنی ہر بات کو حلف نامے کی صورت میں لکھ کر اس کا پابند ہو جاتا ہے اور زندگی بھر اُسے مُکر جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لکھنے والا سوچنے اور سمجھنے کا عادی ہو جاتا ہے پھر وہ نہ چاہتے بھی اتنا پُرخلوص ہو جاتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے خدمات اور خیالات کو دوسرے آدمی کی ملکیت بنا کر خوش رہتا ہے۔ خط واپس مانگنے یا اپنے لکھے کو مٹانے یا منسوخ کرنے کا اختیار بھی کھو دیتا ہے۔ میری رائے یہ ہے وہ لوگ بڑے باکمال اور عظیم تھے۔ جو خط لکھا کرتے تھے۔ ممکن ہے اس دور میں میرے اور آپ کے سوا اور بھی چند لوگ ایسے ہوں۔ جن کو اپنے لکھے پر اعتماد اور اطمینان حاصل ہوتا ہو۔ یہ فیس بک Email, Facebook اور sms وغیرہ پہ سند لینے بھیجا میرے نزدیک آدمی کی مردم بے زاری، اور اسکی اخلاقی پستی کا ثبوت ہے۔ میرا تو خیال ہے آدمی دوسروں کو دھوکہ فریب دینے کے لیے ہی sms استعمال کرتا ہے۔

دو ہفتے قبل ڈاکٹر فاضل میواتی کا sms آیا تھا۔ میرے بھائی چند دن کے لیے پاکستان میں ہوں۔ سوچا تم سے ملتا جاؤں، بھابی سے کہنا کڑی پکوڑے اور زیرے والے چاول اور بھنڈی گوشت کی یاد نے بے چین کر رکھا ہے، جلدی بتاؤ کب حاضری دوں ---؟،،

سچی بات تو ہے کہ مجھے فاضل میواتی صاحب کی یہ بھوک بھری بے تکلفی ذرہ بھر پسند نہ آئی حضرت آپ کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کے لیے آرہے ہیں۔ یا کسی ماہر باورچی کو ہدایات جاری فرما رہے ہیں۔ گھروں کو اپنے موبائل مسائل اور وسائل ہوتے ہیں۔ بلکہ مجھ جیسے آدمی کو تو صرف مسائل ہی مسائل ہوتے ہیں۔ سو میں نے جواب میں sms لکھا کہ ”صاحب ہزار بار آیئے۔ آپ کا اپنا گھر اپنے لوگ ہیں۔ لیکن میں تو طلبہ کے ایک گروپ کے ساتھ چترال میں ہوں۔ آج تیسرا دن ہے۔ پندرہ دن کا ٹور ہے، میرا sms پڑھتے ہی

کلیم خارجی

جھٹ سے انھوں نے ایک sms دے مارا۔ تم گھر پہ نہیں ہو تو کیا ہوا۔؟
برخوردار سعادت علی سے کہہ دیں کہ ہمیں اپنی روایتی مہمان نوازی کی سعادت سے محروم نہ کریں۔ میں نے تین روز تک قیام کرنا ہوگا، کیونکہ میری چند اہم سرکاری عہدہ داروں سے آپ کے شہر میں ملاقاتیں متوقع ہیں میرے ساتھ بسم اللہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر عبدالرؤف بیگ بھی ہوں گے میں نے انھیں تمہاری سخاوت اور مہمان نوازی کے متعلق بتا کران کا شوق بڑھایا ہوا ہے، یہ sms پڑھ کر میرا بلڈ پریشر میرے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگا آنکھوں کے آگے سیاہ دائرے گھومنے لگا۔ شکر ہے کہ میں اپنے بستر پہ لیٹا ہوا تھا۔ کھڑا ہوتا تو منہ کے بل گر پڑتا اور دانت تڑوا بیٹھتا۔ بڑی مشکل سے حالت سنبھلی۔ اذیت کی اس گھڑی میں ذہن نے ساتھ دیا اور میں نے sms لکھا کہ پہاڑی علاقے میں ہوں سگنل کا مسئلہ ہے۔ اس some text missing ہے پندرہ دن کے بعد رابطہ ہوگا۔ لیکن یہ فاضل میواتی بڑا ہی ڈھیٹ بلکہ پھچورا آدمی ثابت ہوا پہلے تو وہ برخوردار سعادت علی کو مسلسل کالز دیتا رہا یہ تو بھلا ہوا ہے کہ وہ میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے بات کرنے سے روکے رکھا۔ آدھے گھنٹے بعد فاضل میواتی صاحب نے میری بیگم کے ذاتی موبائل پہ کالز دینا شروع کیں۔ میرا خون کھولنے لگا۔ بیگم نے سمجھداری سے کام لے کر فون مجھے تھما دیا پہلے تو میں نے موبائل توڑنا چاہا لیکن پھر میں نے سائلنٹ کر کے رکھ دیا۔ اصل میں گزشتہ برس جب یہ آدمی آپ دونوں میاں بیوی کے ہمراہ میرے گھر آیا تو رخصت ہوتے ہوئے اس نے کمال دیدہ دلیری اور بے تکلفی سے میری بیگم سے اس کا نمبر مانگ لیا۔

میری دیہاتی فطرت کی بیوی نے جھینپتے ہوئے مجھے دیکھا تو میں نے مسکراتے ہوئے اجازت دے دی۔ میں نے سوچا نہایت غبی، بھلکڑ اور مصروف آدمی ہے۔ بھول جائے گا لیکن یہ تو بلا کا مکار اور وارداتیا نکلا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں نے اس کے پاؤں دوبارہ اپنی دہلیز پہ نہیں پڑنے دیئے، اگر آپ سخاوت اور مہمان نوازی کے جذبے سے سرشار ہیں تو مجھے اطلاع دیجئے تاکہ میں اونٹوں کا رُخ آپ کی طرف موڑ دوں بصورت دیگر آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میری اور آپکی برسوں پرانی دوستی فاضل میواتی جیسے گھس بیٹھیے ہمارے درمیان کہاں سما سکتے ہیں۔ اُمید ہے ہماری دوستی اور اعتماد کا بھرم قائم رہے گا۔

آپ کا اپنا
امداد پرایا
۵ ستمبر ۲۰۰۱

میرے بہت عزیز و بہت قریب امداد پرایا
سلام اور دُعائیں
حالات قطعی خوشگوار نہیں۔ اصل میں جب آپکا رازدارانہ sms مجھ تک پہنچا۔ تو حضرت میرے ہاں براجماں ہو چکے تھے۔ اگر آپ صرف تیس منٹ پہلے مجھے آگاہ کر دیتے تو میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرنے سے محفوظ رہتا۔ آپ سے محرومی کا احساس لیے فاضل میواتی صاحب بغیر کسی اطلاع کے بلائے ناگہانی کی طرح میرے گھر آدھمکے۔ آپ میرے بہت پرانے اور بااعتماد دوست ہیں۔ لیکن فاضل میواتی صاحب کے معاملے میں آپ کا قصور معاف نہیں کیا جاسکتا۔ فاضل میواتی صاحب کے ساتھ ان کے کوئی پرانے یار ڈاکٹر عبدالرؤف بیگ بھی ہیں، جو چہرے مُہرے سے انتہائی مطلب پرست خوشامدی اور موقع شناس نظر آتے ہیں۔ میں نے اپنے دسترخوان پہ منہ چلاتے ہوئے اتنا بھیانک آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پہلی ہی ملاقات میں عبدالرؤف بیگ نامی شخص سے میرا دل اتنا بُرا ہوا ہے کہ میرا ذہن ان کے بارے میں نہایت ذلت آمیز ستم کے شبہات گھڑے چلا رہا ہے۔ میواتی صاحب نے ان کے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے یوں خبر دی ہے بہرام باغپوری صاحب جب ہم کسی کو اپنا بناتے ہیں تو اُسے طاقتور ہونے کا احساس بھی دیتے ہیں۔ یہ ہمارے ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب Phd ہونے کے باوجود ایک سرکاری سکول میں سی ٹی ٹیچر تھے اور صرف سیٹیاں ہی بجایا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم نے ان کی قابلیت کے مطابق ایک ممتاز یونیورسٹی میں رجسٹرار لگوادیا ہے۔ یہ سن کر مجھے یونیورسٹی کی طالبات پہ رحم آنے لگا شدید رنج، احساس زیاں، نفرت اور کوفت سے جان چھڑانے کے بعد میں آپ کو تفصیل سے خط لکھوں گا۔ اب ذرا میری تازہ رُوداد ملاحظہ کریں۔
میواتی صاحب کل صبح گیارہ بجے میرے گھر نازل ہوئے۔ دوپہر کے کھانے پہ اُنھوں نے شوربے والی چنے کی دال، مٹر چاول، روغنی نان چونگیں اور قیمے کی فرمائش کردی۔ میواتی صاحب کا طریقہ واردات یہ ہے کہ جب کسی کے ہاں مہمان بن کر جاتے ہیں۔ تو اس کے شہر کے مشہور کھانوں، دُکانوں اور دیگر لوازمات کا اچھا خاصا سروے کر کے معلومات محفوظ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے میں اُنھوں نے قیوم کی لسی کی فرمائش کردی۔ حاجی قیوم کی دُکان گزشتہ بیس سال سے ہمارے شہر میں لسی کی وجہ سے مشہور ہے۔ رات گئے تک دُکان پر گاہکوں کا ہجوم بنا رہتا ہے۔ شہرت، معیار اور ذائقے کی وجہ سے کئی مشروبات کے

مقابلے میں لسی زیادہ مہنگی ہے۔ میواتی صاحب نے شاہانہ بے تکلفی سے حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ پانی کا کولر خالی کروا کے لسی سے بھروا دیجیے۔ چنانچہ دس لیٹر والا کولر ہمسائے کے بیٹے کو روانہ کیا۔ اس راجپوت نوجوان نے کسی قیمت پر کس طرح لسّی خریدی ایک الگ واقعہ ہے۔ جسے بیان کرتے ہوئے فی الحال مجھے شدید غصہ آئے گا، حالت غیر ہوسکتی ہے اور خط کی فضا خراب ہوجائے گی بہرحال میواتی صاحب نے اپنے ذوق اور برسوں کی بھوک کے مطابق دوپہر کا کھانا کھایا۔ کیا آپ نے میواتی صاحب کو کبھی کسی پرائے دسترخوان پر کھانا کھاتے دیکھا ہے؟۔ اُف وہ بہت گھناونے طریقے سے کھاتے ہیں۔ ان کے دیدے پھیل کر پورے دسترخوان پہ گھومتے رہتے ہیں نوالہ چباتے اور نگلتے ہوئے ہلکے ہلکے ممیاتے ہیں۔ ساری توجہ کھانے پر رکھتے ہوئے اپنے دھڑ، گردن اور کولھوں کو ہلاتے رہتے ہیں۔ زبان باہر نکال کر غذا کا گولا اس پر رکھ دیتے ہیں تو موٹے موٹے ہونٹوں کے دونوں کناروں سے رال باہر نکل کر ٹھوڑی پہ پھیل جاتی ہے جسے بائیں کی ہاتھ کی پشت سے صاف کر کے دسترخوان کے کپڑے پہ پھیر دیتے ہیں۔ غذا پیتے ہوئے کنپٹیوں کی گلٹیاں گیند بن کر اچھلنے لگتی ہیں۔ اور دونوں کان جو عام کانوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے مختلف ہیں۔ کیونکہ ان پر بال کافی ذخیرہ موجود ہے۔ یقین مانیے ان کے کان کھلتے اور بند ہوتے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔ کھانے سے تھک جانے کے بعد میواتی صاحب نے بڑے نفیس انداز میں میرے صاف ستھرے تے ہلکو رسفید تولیے پر انگلیاں خشک کر کے اُس کی بے حرمتی کی۔ اور بے حد داغدار کر ڈالا۔ ابھی وہ دسترخوان پہ بیٹھے ہوئے تھے اُنھوں نے رات کے کھانے میں اپنی پسندیدہ چیزوں کی فہرست جاری کردی۔ کمال رعایت سے کام لیتے ہوئے کہنے لگے۔ آپ نے دوپہر کے کھانے پر بے حد تکلف اور تردد کیا۔ بھابی صاحبہ کی مشقت کی وجہ سے کھانا بے حد لذیذ تھا لیکن اب رات کے کھانے میں خرچہ نہ کیجیے گا۔ سفید چاول پکوا لیجیے گا اور ساتھ میں مشہور پہلوان ہوٹل سے نمک گوشت کی۔ بس ایک کڑاہی کافی ہوگی میٹھے میں اللہ داد کی کھیر مناسب رہے گی"۔

اور ہاں عبدالروف بیگ صاحب حلیے اور گفتگو سے ہی خاص محلے کے آدمی لگتے ہیں۔ اُن کے بارے میں میرے دماغ میں بہت کچھ پک رہا ہے ان کے کھانے کا انداز بھی نرالا ہے۔ صاحب اپنی دائیں آنکھ بند کر کے نوالہ منہ میں رکھتے ہیں۔ جب تک نوالہ منہ میں رہتا ہے، آنکھ یوں بند رہتی ہے جیسے کوئی خاص قسم کا راز بتانے والے ہیں۔ نوالہ چباتے ہوئے ان کی زبان جبڑے کے اندر جو آوازیں پیدا کرتی ہے اُنھیں

آزاد خیال خواتین کی موجودگی میں بھی سننا مجھ جیسے شرمیلے آدمی کے لیے ناممکن ہے۔ تفصیل بیان کرنے سے اُردو زبان وادب کی توہین ہو سکتی ہے۔ یہ مہینہ میرے لیے بہت سے مشکلات لے کر وارد ہوا ہے اپنے بھوک بھرے مہمانوں کی آمد سے چند ازقبل میری مالک مکان سے اتنی زیادہ تلخ کلامی ہوئی کی بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ وہ تو خدا بھلا کرے محلے والوں کا جنھوں نے بیچ بچاؤ کر کے۔ میری جان چھڑائی ورنہ لوگ ضرور میرے خلیے کے مطابق محاورہ بناتے اور سناتے رہتے معاملہ یوں بگڑا تھا کہ چند دنوں سے گھر کے پائپ بند ہو چکے تھے۔ بہت اُلجھن اور تکلیف کا سامنا تھا۔ مالک مکان سے بات کی تو وہ منہ چڑاتے ہوئے بولا، ہم نے آپ کو بہت اچھی اور بہتر حالت میں مکان حوالے کیا تھا۔ آپ خود اس کا بندوبست کریں، گھر کے پائپ آپ لوگوں کی وجہ سے بند ہوئے ہوں گے۔ پتہ نہیں آپ کیا کھاتے ہیں۔ اور کتنا کھاتے ہیں، یہ بات سنتے ہی میں نے مالک مکان کا گریبان پکڑ کے دونا کام سے جھٹکے دیئے۔ قریب ہی مالک مکان کا سانڈ جیسا بیٹا شوارے کا سٹال لگائے کھڑا تھا۔ شور سن کر وہ معاملے میں کود پڑا۔ بیٹے کو دیکھ کر مالک مکان نے میرے خاندانی شجرے کے نام اور کارنامے یوں گھڑ گھڑ کے گنوائے کہ مجھے خود بڑی حیرت ہوئی دُنیا میں ابھی نیک لوگ موجود ہیں۔ مشکل کی اس گھڑی میں حاجی صلاح الدین میرے کام آئے۔ اُنھوں نے مجھے مالک مکان کے بیٹے کی گرفت میں آنے نہیں دیا۔ بات یہاں ختم ہوئی کہ میں گٹر کی صفائی اور پائپوں کی مرمت وغیرہ کا کام اپنے خرچے پہ کراؤں گا۔ چنانچہ اس کام پہ میرے پورے پندرہ ہزار روپے صرف ہو گئے۔ ابھی تین روز ہی ہوئے تھے کہ میں اس سارے کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میرے گھر دستر خوانوں کے غارت گھر، داخل ہو گئے۔ سوچ سوچ کر دل بیٹھے جا رہا ہے کہ اگلے مہینے پھر مجھے گٹر اور پائپوں کی مرمت کروانا پڑے گی۔ مالک مکان کا طنز بھرا طعنہ میرے کانوں کی لویں گرم کیے رکھتا ہے۔ مجھے آپ سے یہی گلہ ہے کہ جیسے آپ خود بچ گئے تھے۔ مجھے بھی بچا سکتے تھے۔ لیکن کیا کیجیے غالب نے کیا کہہ دیا ہے ہائے

ہوئے تم دوست جس کے دُشمن، اس کا آسماں کیوں ہو

.....

اپنا موبائل فون آن اور Active رکھیے گا۔ تاکہ میری خبر گیری کر سکیں۔ اکثر کام پڑنے پہ آپ کا موبائل فون بند ہو جاتا ہے۔ بہت بے چین و پژمردہ

بہرام باغپوری

۲۰ ستمبر ۲۰۰۱

☆☆☆☆

پاگل شاعر

محمد احمد

ادریس محمد جمّاع سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے نواحی شہر حلفایۃ الملوک میں پیدا ہوا۔ سن ولادت 1922ء ہے۔ غربت میں پرورش پائی۔ اپنے شہر سے ہی 1930 میں قرآن مجید حفظ کیا۔ غربت کے سبب اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ 1934 میں سوڈان کے شہر درمان میں تعلیم حاصل کرنے گیا۔ 1946 میں سوڈان کے شہر بخت رضا میں ٹیچر ٹریننگ کالج میں بھی داخلہ لیا۔ 1942 سے 1947 تک یہ اپنے ملک میں بطور سکول ٹیچر کام کرتا رہا۔ 1947 میں مصر آ گیا۔ یہاں قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ 1951 میں اسی یونیورسٹی سے عربی زبان وادب واسلامیات کی ڈگری حاصل کی۔ 1952 میں یہ مصر سے واپس سوڈان آ گیا۔ یہاں مختلف دور دراز دیہی علاقوں میں سکول ٹیچر رہا۔

ادریس محمد جمّاع کا صرف ایک دیوان ہے، جس کا نام ہے ”جاوداں لمحے“۔ اب تک یہ کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کے دیوان میں موجود قصیدوں میں سے چند ایک کے نام ملاحظہ کیجیے:

(1) تو آسمان ہے۔ (2) باعزت قوم (3) بچپن (4) فطری گیت (5) نہ ختم ہونے والی لڑائی (6) بہار کی محبت (7) بلندی کی طرف (8) بے شک میرا شوق آٹے کی طرح ہے (9) ضمیر کی حدود ہیں (10) زندگی کا پیغام (11) زندگی کا راستہ (12) چرواہے کی نیند (13) سلاخوں کے پیچھے کی آواز (14) میرا خون (15) ہوا کے جھونکے میں (16) چاند (17) ابد کی دنیا (18) شاعر کے چشمے (19) بے شک میں ضرور پسند کرتا ہوں (20) نیل کا سفر۔

شاعری کے موضوعات: غور و فکر، محبت، حسن، حکمت، مزاحمت، وجدان، خوشی اور غم کے جذبات کی عکاسی اس کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ اس نے قومی و ملی نغمے بہت زیادہ لکھے اور ان کو سوڈانی فنکاروں نے خوب گایا۔ سوڈان، الجزائر، مصر اور فلسطین کے مسائل پر بھی اس نے شاعری کی۔ حسن کو دیکھنے پھر اس کو اپنی شاعری میں بیان کرنے میں جناع کو خصوصی مہارت حاصل ہے۔ اس کی شاعری ذہنی کشمکش پر مشتمل ہے۔ استعماری طاقتوں کے خلاف اس نے مزاحمتی شاعری کی۔ دریائے نیل پر بھی اس کے قصیدے ہیں۔ بحر بسیط اور بحر طویل میں اس نے شاعری نہیں کی۔ اپنے ملک، عرب دنیا اور اسلامی دنیا کو اس نے اپنی شاعری کے ذریعے متاثر کیا۔ اس پر ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر عبدہ بدوی نے اپنی کتاب ''سوڈان میں جدید شاعری'' میں ادریس محمد جناع کا خصوصی اور تفصیلی ذکر کیا ہے اور اس کو جدید سوڈانی شاعری کا امام کہا ہے۔ اس کے لکھے ہوئے قومی ترانے و ملی نغمے ریڈیو، ٹی وی اور سوشل میڈیا پر گائے اور سنے جاتے ہیں۔ فصیح و بلیغ عربی زبان میں اس نے شاعری کی۔ سوڈان میں عربی زبان سیکھانے کی درسی کتابوں میں اس کی شاعری کو شامل کیا گیا۔

فطری طور پر ادریس محمد جناع حسن پرست ہے۔ حسن کا قیدی ہے۔ زندگی کے آخری دور میں یہ ناکام محبت کا شکار ہوا۔ جس کے نتیجے میں یہ پاگل ہو گیا۔ یہ شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ اس کو سوڈان کے مقامی پاگل خانے داخل کرایا گیا۔ پھر لندن کے پاگل خانے لے جایا گیا۔ وہاں بھی اس کا علاج نہ ہو سکا۔ اس کو واپس سوڈان لایا گیا۔ یہاں اس کی وفات 1980 میں پاگل پن کی حالت میں ہوئی۔ اس نے 58

برس عمر پائی۔
عظیم سوڈانی شاعر ادریس محمد جماع کو علاج کی خاطر لندن لے جایا جا رہا تھا۔ سوڈانی ایئرپورٹ پر اس نے ایک خوبصورت خاتون کو دیکھا جو اپنے خاوند کے ساتھ تھی۔ یہ مسلسل اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ خاوند نے شاعر کو منع کرنے کی کوشش کی تو اس نے درج ذیل اشعار پڑھے:

کیا سب سے اعلیٰ خوبصورتی ہم سے ناز کرتی ہے؟
ہم کیوں نہ اس کو دیکھیں؟

اس نظر سے تو شان و شوکت بھول جاتی ہے
اور روح بلندیوں پر پرواز کرنے لگ جاتی ہے

آپ ہی میری دنیا ہو اور آپ ہی میری خوشی ہو
دل تمنا کرتا ہے تو آپ کی ہی تمنا کرتا ہے

آپ ہمارے لیے آسمان ہو
اور آپ ہم سے دوری چاہتے ہو؟

....

جب مصر کے معروف شاعر و نقاد عباس محمود العقاد نے ان اشعار کو سنا تو پوچھا: اُن کا شاعر کون ہے؟ اس کو بتایا گیا کہ یہ سوڈانی شاعر جماع ہے جو اس وقت پاگل خانے میں زیرِ علاج ہے۔ عقاد نے کہا: یقیناً اتنے اعلیٰ شعر کہنا اسی کا مقام ہے۔ باکمال پاگل ہی یہ شعر کہہ سکتا ہے۔ عام شاعر اس طرح کے اشعار نہیں کہہ سکتا۔"

جب لندن میں ادریس محمد جماع زیرِ علاج تھا تو یہ نرس کی آنکھوں کو بغور دیکھتا رہتا تھا۔ نرس نے ہسپتال کے سربراہ کو بتایا۔ اس نے کہا کہ سیاہ عینک لگا کر جایا کرو۔ جب نرس سیاہ عینک لگا کر شاعر کے پاس آئی تو اس نے کاغذ قلم منگوایا اور یہ شعر لکھا:

جو تلوار نیام میں ہو اس سے کٹ جانے کا خوف نہیں کیا جاتا
مگر آپ کی آنکھوں کی تلوار دونوں حالتوں میں کاٹ دار ہے

جب اس شعر کا نرس نے ترجمہ کروایا تو وہ چیخیں مار مار کر روئی۔ عربی شاعری کے نقادوں کے مطابق جدید عربی غزل کا یہ بہترین شعر ہے۔ شاعر کے چند دیگر اشعار ملاحظہ کیجیے:

یقیناً میرا شوق آٹے کی طرح ہے جس کو انھوں نے کانٹوں پر بکھیر دیا
پھر انھوں نے تیز ہوا والے دن برہنہ پاؤں والے کو کہا اس کو اکٹھا کرو
ان کے لیے تو یہ بڑا مشکل کام تھا پھر انھوں نے کہا اس کو چھوڑ دو
جس کو میرے رب نے بدحال بنا دیا تم اس کی خوش نصیب کیسے بنا سکتے ہو؟

☆☆☆☆☆

''سرابی'' اُردو نثری نظم کا غیر معمولی اظہار

نثری نظم کی ساخت، ہیئت اور تکنیک باقی اصنافِ سخن سے مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جتنی آسانی موجود ہے اتنی ہی ذمہ داری بھی قبول کرنا پڑتی ہے۔ جدید شعرا کی کثیر تعداد نے نثری نظم میں تخلیقات کا انبار لگا دیا ہے مگر معدودے چند شعرا کے ہاں ذمہ دارانہ طرزِ عمل ملتا ہے۔ عام طور پر نظم زیادہ سے زیادہ تین صفحات میں مکمل ہو جاتی ہے نثری نظم میں طویل اختصار یا طوالت کا جواز بھی (باقی اصناف سخن کی طرح) دینا پڑتا ہے۔ مختصر اور طویل نظموں کے باب میں موضوع، مواد اور مضمون کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

فرحت عباس شاہ کی نظم ''سرابی'' چھپن نظموں پر مشتمل مونتاج کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک بڑے کینوس پر چھپن تصاویر بنا دی گئی ہیں جو باہم مل کر ایک بڑی تصویر کو ترتیب دیتی ہیں۔ نظم ایک طویل کہانی کے مرکزی کردار صیغہ واحد متکلم اور اسم ضمیر کے تار و پود کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ حیرت انگیز طور پر تخلیقی وفور کا شاہکار بھی ہے۔ نظم کا آغاز بند کمرے کی گھٹن، مایوسی کی انتہا اور محبت کی

شاہد اشرف

جستجو سے ہوتا ہے اور اسی دوران میں مرکزی کردار کی سرابی سے ملاقات ہوتی ہے، جس کی محبت اُسے زندگی کی طرف کھینچ لیتی ہے اور اُس کے اردگرد خوشیاں رقص کرتی ہیں۔

مرکزی کردار ''سرابی'' سے شدید محبت کے باوجود اُسے حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اُسے سماجی حیثیت، شکست وریخت اور کم مائیگی کے نتیجے میں بے توقیری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود وہ سخت جان واقع ہوتا ہے۔ شدید رنج کی وجہ سے آنسو ٹپکتے ہیں تو وہ انھیں صبر، ہمت اور حوصلے کی راکھ سے خشک کر لیتا ہے۔ یوں وہ جسمانی طور پر طاقت ور ہو جاتا ہے۔ وہ سخت ریاضت، مشقت اور کثرت سے اپنا لوہا منوا لیتا ہے۔ اسی دوران میں کہیں اُس کے اندر چراغ روشن ہوتا ہے۔ وہ کتابوں کی دُنیا آباد کرتا ہے۔ اُس کے اندر روشنی بڑھتی جاتی ہے۔ جب کہ اہلِ قلم کی محبت اُسے منافقت، خودغرضی اور مفاد پرستی کے باعث شدید رنج سے دوچار کرتی ہے۔ سرابی سے محبت نوعِ انساں کی محبت میں ڈھل جاتی ہے۔ اُس کے شہر میں وحشت در زندگی اور خوف کا راج ہوتا ہے۔ مسلک کی بنیاد پر نہ ختم ہونے والا قتل و غارت کا سلسلہ اُسے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بڑے شہر میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ وہ چھوٹے جنگل سے بڑے جنگل میں آ گیا ہے۔ وہ کشتیاں جلا دیتا ہے مگر سرابی کی محبت اُسے بے چین رکھتی ہے۔ یہاں کہانی موڑ لیتی ہے۔ وہ سرابی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ماضی کی حسین یادوں کو دہراتا ہے۔ اسی دوران میں کوئی اُسے ٹوٹ کر چاہنے لگتا ہے۔ جیسے کوئی داسی مندر میں دیوتا کے سامنے بیٹھ کر پرستش کرتی ہے۔ وہ دیوتا بننے سے انکار کرتا ہے وہ تقسیم نہیں ہونا چاہتا ہے۔

سرابی شہر چھوڑ دیتی ہے اور شہر ویران ہو جاتا ہے۔ وحشت ناچتی ہے اور ہر سو سناٹا پھیل جاتا ہے۔ سرابی قصۂ پارینہ بن گئی ہے مگر جب کوئی ڈھونڈنے کے لیے نکلتا ہے تو اُسے دل کے قریب پالیتا ہے۔

سرابی دراصل مرکزی کردار کی انفرادی محبت ہے جو بعد ازاں آفاقی محبت میں ڈھلتی ہے۔ سرابی فرد، معاشرے، نظام اور شہر سے وابستہ خوشیوں کا دوسرا نام ہے۔ جب فرد، معاشرے، نظام اور شہر سے محبت رخصت ہوتی ہے تو افراتفری، فساد اور تعصبات جنم لیتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں محبت کی شاعری کرنے والے عظیم بننے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اذیت دے کر خوش ہوتے ہیں۔ مذہب کے پیروکار اپنی دکانیں چمکاتے ہیں۔ اور لوگوں کو لڑاتے ہیں۔ ان دو طبقات کا بطور خاص ذکر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اگر اہلِ قلم اور اہلِ مذہب اپنی سمت درست کر لیں تو فرد اور معاشرے کے معاملات

ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ بے چینی، اضطراب، عدم تحفظ اور مغائرت کی بنیادی وجوہات میں ادب اور مذہب کے علم برداروں کے ذاتی مفادات اور مقاصد شامل ہیں۔ وہ جزوقتی فائدے کے لیے اجتماعی مفاد کو فراموش کر دیتے ہیں۔ یوں بدامنی، جہالت اور بے حسی کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ تربیت کے دو بڑے مراکز اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں نہیں ہوئے ہیں۔

یہ نظم آپ بیتی اور ناول کی تکنیک کے فریم ورک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب فرحت عباس شاہ مَیں کا صیغہ استعمال کرتے ہیں تو نظم پر آپ بیتی کا گماں ہوتا ہے اور وہ کا صیغہ اسے ناول کے قریب تر کرتا ہے۔ مجھے اس نظم میں جا بجا فرحت عباس شاہ کی ذاتی زندگی کا عکس بھی دکھائی دیا ہے۔ جھنگ میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور لاہور کے ادبی حلقے بطور خاص اس باب میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔ آپ بیتی میں مرکزی کردار کے گرد کہانی گھومتی ہے اور وہی راوی ہوتا ہے وہ مختلف واقعات میں سلسلہ در سلسلہ سفر کرتا ہے۔ ناول میں کردار، پلاٹ، کلائمکس، قصہ، مکالمہ اور منظر کشی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے ناولوں میں صیغہ واحد متکلم کا استعمال بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ دونوں نثری اصناف کی عکاسی کرتی ہے۔ نظم میں ناول یا آپ بیتی کا تجربہ قابلِ توجہ ہے۔ بظاہر نظم کا موضوع محبت ہے مگر اس محبت میں سماج کے مختلف کردار سامنے لانے کی کوشش بھی موجود ہے۔ ان کرداروں کی وجہ سے معاشرے میں ناہمواری پائی جاتی ہے، جو ہماری زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ فرد کے انفرادی معاملات سے معاشرے کے اجتماعی تصورات تک نظم میں ہر رنگ جلوہ گر ہے۔ ان رنگوں کے ملنے سے سرابی بنتی ہے۔ سرابی محبت کا دوسرا نام ہے۔ جو آہستہ آہستہ دلوں سے رخصت ہو گئی ہے۔ یہ آفاقی جذبہ لوگوں کو قریب لا کر ناہمواریوں کے خاتمہ کا سبب بن سکتا ہے۔

فرحت عباس شاہ ہمہ جہت پہلو ادیب ہیں۔ میں نے اِس نظم کو پڑھتے ہوئے اُن کے معاشی، سماجی، رومانی، سیاسی، مذہبی اور ادبی تصورات سے آگاہی حاصل کی ہے۔ غیر محسوس انداز میں وہ قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں اور اپنے خیال، منظر یا کردار کے ذریعے اُن مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جن کے باعث لوگوں کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔ وہ صاحب فکر انسان ہیں اور خیر کے نمائندے بھی۔ اِس اعتبار سے اس نظم کا دائرہ ذات سے آفاق تک پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ طویل نظموں کے باب میں ''سرابی'' ایک عمدہ اضافہ ہی نہیں بلکہ نظم گو شعرا کو ایسی نظمیں لکھنے کے لیے مہمیز بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

شجاعت راہی کا اسلوب بحوالہ بلیک باکس

میرا شجاعت علی راہی سے کتابانہ تعارف برادرم ڈاکٹر نثار ترابی کے توسط سے ہوا۔ فون پر کہا کہ ایک قریبی دوست کا سفرنامہ بھجوا رہا ہوں اور تم کو کتاب کا مزہ نہ آیا تو جرمانہ بھروں گا؟ میں نے حسب روایت و عادت ممنونیت سے انتظار شروع کر دیا۔ اگلے دن کتاب پاکستان پوسٹ کے ہرکارے کے ہاتھوں میں تھامی رسید پر دستخط کے عوض وصول پائی۔ وہیں لفافے کو چیرا پھاڑا اور اگلی کلاس کے شروع ہونے تک کتاب کی ورق گردانی کا قصد کیا۔ کتاب کی فہرست کھولی تو دیکھا کہ کتاب اٹھارہ ابواب میں بٹی ہے اور ابواب سرخیوں میں تقسیم ملے۔ میری بچپن کی عادت ہے کہ میں سرورق اور فہرست سے ذہن میں تاثر نہیں بننے دیتا کہ پھر بندہ اپنا ذوق و شوق کھو دیتا ہے۔ کچھ دن تو کتاب کو سامنے رکھا کہ یہ ایک ضخیم کتاب تھی، میری ایک بیماری یہ بھی ہے کہ جو کتاب بھا جائے تو اس کو پھر چھوڑ کر نہیں اٹھ سکتا۔ پھر وہی ہوا کہ جس کا ڈر تھا۔ ایک رات کے پچھلے پہر آنکھ کھلی اور میں ایسے ہی بلانیت کتاب کھول لی صفحہ نمبر ۱۱۲:

جس نے کاٹی ہو وہی مجھ کو بتائے ، راہی
اک شبِ ہجر میں ہوتے ہیں زمانے کتنے

اسی صفحے سے پڑھنا شروع کر دیا، ''بوجی'' سے ملاقات ہوگئی، بس پھر تو لفظوں سے ہوتا ہوا معنیوں تک پہنچا، گویا ریگستانی کوئی میٹھے پانیوں تک پہنچا، وقت کا پنچھی بھی وہیں کہیں لیمپ کی محدود کی گئی روشنی کے عقب میں تھا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز شجاعت راہی کے رہوارِ قلم پر سوار چل پڑا، اب جب کالج جانے کے لیے لگایا گیا الارام بولا تو ۴۶۴ پر:

یہ زندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے
تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایا
(فراق)

اگلے دن اس کتاب کو ختم کر دیا اور دل خوش تھا، ایک سرشاری تھی، ایک خماری تھی۔ یہی کیفیت اس مضمون کی وجہ بنی کہ ایسا کیا ملا کہ میں اس کتاب ''بلیک باکس'' کہ جو خود نوشت تھا کا اس قدر لطف اٹھا پایا ہوں۔

عادل سعید قریشی

میں نے سوال کو سامنے ایک کاغذ پر لکھ لیا اور لمحہ بھر آنکھیں موند کر سوچنے بیٹھا۔

بلیک باکس، خود نوشت، (سن اشاعت ۲۰۱۸ء) خود نوشت کے بارے میں، میں ہمیشہ محتظ رہا ہوں کہ کسی اور کی زندگی کا اتنا تفصیلی مطالعہ چہ معنی۔ بھلے وہ زندگی اپنی ہی کیوں نہ ہو، بھائی جو گزر گیا سو گزر گیا۔ میرے ایک شاگرد نے بھی ایک ایسا سوال کیا تھا کہ علی پور کا ایلی میں کیوں پڑھوں، اس سے مجھے کیا حاصل ہوگا۔ میں نے نجانے اس کو کیا جواب دیا ہوگا مجھے یاد نہیں لیکن آج بالکل وہی سوال خود میرے سامنے آن موجود تھا۔ سوال اس قدر جاندار تھا کہ میں اس سے نظریں نہیں چرا پایا تو پھر دوبارہ بلیک باکس کو حرف اول سے پڑھنا شروع کیا تا کہ میں وہ وجہ جان سکوں کہ اس کتاب نے مجھے کیوں کر متاثر کیا ہے۔

شجاعت علی راہی کی کتاب کا ''بلیک باکس'' کا اصل حسن اس کا اسلوب نکلا!

اسلوب کی کوئی بھی تعریف اپنے ذہن میں دہرا لیجیے جسے آپ مانتے ہوں، وہ مجھے بھی قبول ہوگی، یعنی اسلوب کہ جو کسی لکھاری کا وہ منفرد انداز ہے جو اس کو اپنی زبان و ادب کی صنفی روایت کی سانجھ کے باوجود ایک الگ لب و لہجہ، طرزِ نگارش، لفظیات، بیان کا سلیقہ رکھنے کے سبب دوسرے ہر لکھاری سے جدا کرتا ہے اسلوب کہلاتا ہے۔ شجاعت راہی کا اسلوب کمال کا ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ، بیان کی خوش سلیقگی، برجستگی اور شائستگی، واقعات کی ترتیب، مرقع نگاری، جزئیات نگاری، محاکات نگاری، ڈکشن، روزمرہ اور بول چال کا رواں طریقہ، واقعات کا چناؤ اور انتخاب، یادنگاری کے اصولوں کی بطریق احسن برت، قاری کے دلچسپی کا دھیان، ایجاز و ایمائیت کا اہتمام، قاری سے دوستی نبھانے کی فہم نے مجھے اس تخلیق کار کا گرویدہ بنایا ہے۔

شجاعت کی انشا پردازی اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے، کہیں شاعرانہ برت ہے تو کہیں مورخانہ طرزِ ادا، کہیں افخا ہے تو کہیں اعتراف، کہیں زندگی کے دوش میں اپنی دوڑ کا بیان ہے تو کہیں اپنوں کے ساتھ بتائے لمحات کا حظ، کہیں پردیس میں گھومنے پھرنے کا بیان ہے تو کہیں اپنے دیس کی مٹی کی خوشبو کی تعریفیں، اپنی کامرانیوں کا بیتا ہے تو کہیں اپنے کمزور لمحوں کی کتھا۔ ''بلیک باکس'' ایک خوشنما، خوش رنگ، خش بو دار گل دستہ ہے جہاں ایک بالغ قاری کی دلچسپی کا مکمل سامان موجود ہے۔ خود نوشتیں اکثر بے زار کر دیتی ہیں، کیوں کہ لکھنے والے کا خیال ہوتا ہے کہ جو مجھ پر بیتا اب اس کو من و عن قاری پر ظاہر کر دو، اس کو بھی وہ محسوس کراؤ، دوسرے کو باور کراؤ کہ وہ کیسا تجربہ تھا یا کیسا حسین اتفاق کہ میں ایسی منفرد زندگی جیا ہوں۔ اس کو بھی بتاؤ کہ کیسے ہم نے فلاں شرارت سے مزہ کشید کیا تھا، کیسے ہم نے اپنی اس غلطی کو دوسروں سے چھپا لیا، قاری کا رجحان اور قاری کا تقاضا اکثر بیشتر سوانح نگار سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن شجاعت

علی راہی کمال کا وہ قاری دوست لکھاری نکلے۔
''بلیک باکس'' میں شجاعت نے ساری رودادِ حیات ہی پیراگرافوں کی صورت میں لکھ دی، اگر بالفرض محال کوئی ایک موضوع، کوئی ایک واقعہ، کوئی ایک یا کوئی موضوع آپ کو متاثر نہیں کر رہا یا آپ کی طبیعت کسی ایک موضوع سے اوب رہی ہے تو آپ بلا تکلف اور نہایت آسانی سے اس پیراگراف کو صرف نظر کر سکتے ہیں گو میری یہ نوبت نہیں آئی میں نے ان کے ہر ہر موضوع، ہر ہر مقام، زندگی کے ہر ہر واقعہ کو پڑھا لیکن ایسا کیا جا سکتا ہے۔ (یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہوگی)۔
میں اپنے موضوع کی طرف گریز کرتا ہوں کہ شجاعت علی راہی کا خود نوشت اسلوب ہی اس کی اصل طاقت یا اصل توانائی ہے۔ شجاعت کا اسلوب کے سبھی اجزا کا حامل ہے یقیناً یہ مختصر مضمون نہیں ہو سکتا۔ میں یہاں چند نکات کو اشارۃً مذکور کروں گا تا کہ قاری اصل حظ خود کتاب سے پائے۔ اول اس کتاب کی زبان نہایت سلیس اور رواں ہے، لکھنے والے کو بخوبی علم تھا کہ اس کا قاری کس طرح کی زبان کو پسند کرے گا، گو موضوع بھی ایسا تھا کہ زبان کی ثقالت کا متقاضی ہی نہ تھا لیکن تخلیق کار نے جہاں کہیں ایسی بات سامنے آئی بھی تو اس نے نہایت خوش اسلوبی اور سادگی سے بیان کر دیا۔ سادگی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ شجاعت کے ہاں روانی بھی لائق تحسین ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے داستان گو کی طرح اس کتاب میں آلتی پالتی مارے بیٹھ جاتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو سرگشتِ حیات سناتا جاتا ہے۔
شجاعت کا شاعرانہ مزاج بھی ایک ایسی خوبی ہے جس نے کتاب ''بلیک باکس'' کو دلچسپ، لطف آمیز اور جاذبیت بخشی ہے۔ شاعرانہ مزاج کے سبب شاعری کی سی صناعی قاری کے خوش گواری اور تفریح کو ہر ہر صفحے پر قائم رکھتی ہے۔ صفحہ نمبر ۳۴ پر لکھتے ہیں
''پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یکے بعد دیگرے کئی مناظر آنکھوں کے پردے پر رقص کرتے نظر آتے ہیں اور میں منیر نیازی کی طرح وقت کے جنگل سے گزر رہا ہوں:
صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا، منیر!
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

.....

اس طرح وہ جابجا اشعار کا ایسا باکمال بگھار لگاتے ہیں کہ روح کو فرحت و تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ جملوں کی بنت میں ان کا شاعرانہ مزاج اپنا کمال ایسے دکھاتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس جملے کو الگ سے بندہ لکھ لے اور بار بار حظ اٹھائے۔ الفاظ و تراکیب کا بالیدہ ذوق ان کی کتاب ''بلیک باکس'' کے ہر صفحے پر داد خواہ ہے۔
شجاعت علی راہی کی زبان کی چاشنی میں مختار مسعود جیسا طمطراق نہیں نہ ہی یوسفی جیسی چٹکلے ہے لیکن شجاعت کی زبان ان کے اپنے شاعرانہ مزاج کے سبب اپنے قاری کو ایسے ڈور سے باندھ لیتی ہے کہ پھر اس کے لیے کتاب کو ادھورا

چھوڑنا ممکن نہیں رہتا۔ صفحہ نمبر ۳۶۰ پر لکھتے ہیں:
''میرے لیے فیصلہ آسان نہیں تھا اور ایک دلیر آدمی کی حیثیت سے مجھے ہر چہ بادا باد کہہ کر جلد از جلد واپس جانے کا فیصلہ کر لینا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کمزوری کا وہ کون سا لمحہ تھا جب میں نے نہ لوٹنے کا فیصلہ کر لیا:

پالتے پوستے ہیں پھول سا خود کو لیکن
آنکھ کھلتی ہے تو کانٹوں میں بدل جاتے ہیں
چڑھ جاتے ہیں چٹانوں پہ بڑے جو کھم سے
ایک کمزور سے لمحے میں پھسل جاتے ہیں''

.....

پوری کتاب ان کے شاعرانہ مزاج کی ایک ایسی دستاویز ہے کہ جس کو پڑھ کر ہی لطف لیا جا سکتا ہے اور ان کی نثر کی شیرینی اور چاشنی کا مزہ لیا جا سکتا ہے، اردو زبان کو ایسے لکھنے والوں کی اشد ضرورت ہے کہ اردو زبان کو خالص اردو میں لکھ سکیں اور عہدِ حاضر کی انگریزی سے اس کو نخالص نہ کریں۔

شجاعت علی راہی کے اسلوب کی تیسری خوبی ان کا اختصار و ایمائیت سمجھتا ہوں۔ میرے لیے خود نوشت پڑھنا کبھی بھی دلچسپی کا تجربہ نہیں رہا بجز چند ایک جن میں ترکِ سلطانی، شہاب نامہ، کہتا ہوں سچ---، جو رہی ہے سو بے خبری رہی ہے، م۔ ک۔ گاندھی کی خود نوشت وغیرہ لیکن شجاعت علی راہی کی اس خود نوشت نے بہت لطف دیا ہے۔ عموماً ہوتا یوں ہے کہ خود نوشت میں تفصیلات اور معلومات کا انبار قاری کی طبع پر گراں بار ہو جاتا ہے۔ تخلیق کار کہ جو ایک ایسی کہانی لے بیٹھتا ہے جو خود اس کی زندگی کا خاص موڑ ہوتا ہے لیکن قاری کے لیے اس میں اس قدر دلچسپی کا سامان نہیں ہوتا کہ وہ اس پر اتنا وقت صرف کرے، ثانیاً اس بات پر اس سوانح عمری کا مجموعی تاثر خراب ہو جاتا ہے اور یہ ایک عام سقم ہے۔ ''بلیک باکس'' اس سقم سے مکمل طور پر بری ہے کہ شجاعت علی راہی نے اس کتاب میں نہایت خوش سلیقگی اور شعور سے اختصار اور ایمائیت دونوں خوبیوں کا اہتمام کیا ہے۔ ہر واقعہ اور ہر کہانی کو انھوں نے طوالت سے مامون رکھا ہے اور کہانی بیان کرنے کا خاص ملکہ ہونے کی وجہ سے بیان میں تازگی اور چاشنی قاری کا دل موہ لیتی ہے۔ انھوں نے کہانیوں، معلومات اور اپنی فتوحات کی بھرمار جمع نہیں کی بلکہ ایک متوازن، دلچسپ، دلآویز اور قابلِ مطالعہ مواد سے اپنے قاری کی تواضع کی ہے۔

''بلیک باکس'' از شجاعت علی راہی ایک شان دار اور جاندار تخلیق ہے جو اپنے صاحب اسلوب لکھاری کا ایک مستند حوالہ ہے۔ شجاعت راہی کی یہ کتاب ان کی علمیت، ان کے تجربہ کاری، عمیق مشاہدے، اعلیٰ انشا پردازی، قاری کی نفسیات کی فہم، داستان گوئی کے فن سے واقفیت اور شاعرانہ مزاج کا ایسا حسن امتزاج ہے کہ جس کو اردو ادب میں ایک الگ مقام حاصل ہو گا اور خود نوشتوں میں اس کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

رنگ خوابیدہ پڑے ہیں ___ ڈاکٹر شاہد اشرف

ادب ذاتی خیالات اور محسوسات کا ایسا اظہار ہے جو اس رنگ و بو کا مرقع دنیا کے بارے میں تخلیق کار کا اپنا نقطہ نظر ہے۔ جو اس کی سوچ کا عکس ہے۔ جو اس کے اپنے اور اپنوں کے سانحے ہیں۔ خوشیاں ہیں۔ ہجر و فراق کی کہانی ہے۔ محبت کے زخموں کی رفوگری ہے۔ معاشرے کی طرز ہے۔ جسے اگلی نسلوں تک تخلیق کار کے عہد کی نمائندگی اور منتقلی کرنی ہے۔

غزلیں، نظمیں دامن کو پھیلائے وسعت قلبی سے نوع انسان کے سارے درد سمیٹ لیتی ہیں۔ سارے موضوعات سبھی عنوان ہمیشہ نئے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان کی موت سے کسی دوسرے انسان کی زندگی جنم لیتی ہے۔ کائنات اسی مسمار اور تخلیقِ نو کے تسلسل سے چل رہی ہے۔ نظمیں نمو پا رہی ہیں اور درد سمیٹ رہی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اگر انسان کو بات کہنے کا سلیقہ نہ ہوتا، شعور میں اوزان کے پیمانے ترتیب نہ پاتے تو یہ نمائش (دنیا) کچھ روکھی پھیکی سی ہی ہوتی۔ بے رنگ، بے مزہ۔ بات کہنے کے اس سلیقے نے احساس و جذبات کو کیسی آسودگی بخشی ہے۔ کہ سارا جنوں لفظوں کے حوالے کر کے لکھنے والا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔ یہ لفظ وحشت سے بچاتے ہیں میرا ایک شعر ہے۔

بس جنوں کا کمال ہے ورنہ
مر ہی جاتے کبھی کے وحشت سے

.....

جنوں کو نظموں نے اپنی آغوش میں پناہ دی ہے۔ آج میرے پاس ڈاکٹر شاہد اشرف کی نظمیں ہیں۔ کتاب ہے ''رنگ خوابیدہ پڑے ہیں'' نام ہی بہت خوبصورت ہے۔ زندگی کا غماز، مہکتے بہکتے، ہنستے روتے احساسات کا ترجمان، جذبات کا عکاس یہ نام مجھے ڈاکٹر صاحب کی ایک منفرد شخصیت دکھاتا ہے جہاں وہ بہت شائستگی سے، نفاست سے لفظوں کے تال میل میں نظمیں پرو رہے ہیں۔

ساری نظمیں اپنے اردگرد کے ماحول سے کہانیاں لے کر حساس شاعر کے حلقہء دل میں جاگزیں

ثمینہ سیّد

ہو گئیں تو انھوں نے سانچوں میں ڈھال دیں۔ شکلیں بنا ڈالیں۔ سرشار، اداس، محبت سے مغلوب، ہجر سے بوجھل، فطرت کی ثناخوانی میں مصروف، آفات پہ نوحہ گری کرتی کتنی ہی مجسم نظمیں۔

پہلی ہی نظم ان کے منفرد اسلوب کی غماز ہے۔

''کمسن قالین باف دربار رسالت میں'':

تھکن سے چور ان ہاتھوں پہ چھالے جمع کرتے ہیں
زہے قسمت یہ پونجی ہاتھ ننھے جمع کرتے ہیں
ہر اک دھاگے پہ پڑھتے ہیں درود ان پر، سلام ان پر
یہی اجرت ہے جو قالین بُن کے جمع کرتے ہیں

.....

ایسے بابرکت آغاز نے ہی دل خوش کر دیا۔ میں نظموں کی حیرتوں میں گم ہو کر داد و تحسین دینے پر مجبور ہوں۔ نظم ایسی پیاری، نرم رو اور مسلسل تخلیق ہے کہ اس میں سے ٹکڑے انتخاب کرنا وہ بھی ایسے جو پوری نظم کی نمائندگی کر سکیں ایک مشکل ترین کام ہے۔

''چشمہ'' میں لکھتے ہیں:

اگر ناراض نسلوں کا کوئی ردعمل ہے
تو سبب یہ ہے کہ عصر کربلا سے آج تک دریا
پہ پہرے ہیں
ہمارے ہونٹ پانی کو ترستے ہیں
یہ کیسا سانحہ ہے، ہر کوئی حیرت زدہ ہے
جہاں پر بم پھٹا ہے، اب وہاں سے ایک
چشمہ پھوٹ نکلا ہے

.....

''ساعت منتظر ہے'' میں ایک نومولود کی آمد اور اس کی آخری ہچکی سے شاید کوئی ذاتی دکھ جڑا ہے۔ ''عزیٰ، درگا، سیرس'' میں کیسے کیسے تاریخی حوالے اختصار کے باوجود اپنا حسن برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

یہ دنیا سرمایے کے لٹو پر گھوم رہی ہے
عزیٰ درگا ساکت ہیں سیرس ماتا جھوم رہی ہے

.....

کمال مہارت سے معاشی استحصال اور سماجی رویوں کو قلم بند کرتے ہیں۔

پہاڑی راستے پر ایک قیام گاہ، ''تم کہاں ہو'' میں ایک طالب علم کی موت کو نظم میں ڈھالا۔ ''شال'' کے منہ سے اس کا دکھ بیان کرتے ہیں تو ''کمرۂ امتحان'' میں:

زندگی ہے یا اجل ہے
فیصلے میں جو لکھا جائے وہی تصویر ہے
اور جو کیا جائے وہی تقدیر ہے

.....

''ماں مجھے بتاتی ہے'' بہت عمدہ اور رواں نظم جس میں ماں نے سکول سے لے کے گھر کی ایک ایک تفصیل جس پیار سے بتائی ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے سنانے میں الگ ہی خوشبو بکھیرتی ہے ایسے لگتا ہے وہ انھی دنوں میں لوٹ جاتے ہیں جہاں ''ماں'' تھی:

جن نے شاہزادی کو قید کر کے رکھا تھا
تم اس کہانی میں راجہ بن کے آتے تھے

.....

اگلی نظم میں اپنے بیٹے کے لیے کہتے ہیں:

میں چونک اٹھا پرندے کی صدا سے
مرے بیٹے نے پہلی بات کی ہے

میں تیرے جسم میں زندہ رہوں گا
مری پہچان میرے بعد بھی ہے

.....

بہت سادہ لہجے میں کیفیات کو نظم کرنے کی مہارت گرفت میں لیتی محسوس ہوتی ہے۔ سیلاب کے لیے لکھتے ہیں:

میں نے کشتی سے کھلے پانی میں دیکھا شاہد
موج اچھلی تو کئی پھول سے بچے ابھرے

.....

آٹھ اکتوبر کے زلزلے کو یوں نظم کے حوالے کرتے ہیں:

میں یہاں ہوں نکالو خدارا مجھے
کوئی سنتا نہیں ہم نشیں سو گئے
ڈیسک پر سب کتابیں کھلی رہ گئیں
بنچ پر بیٹھے بچے وہیں سو گئے

.....

اسی طرح ''کفن پوش جلوس'' گوٹھ سکوں آباد، ڈائری، دھند، ایک منظر، چاغی مہک اٹھا، وادی، ایک لیڈر کی موت، دریائے اردن، اور رنگ خوابیدہ پڑے ہیں بہترین نظمیں ہیں:

رنگ خوابیدہ پڑے ہیں
اس لیے تصویر کو اوگھ آ گئی ہے

تیرے قاتل کو پتا ہے
کینوس پر خوں بکھرتا تو کوئی شہکار بنتا
اس لیے خوں فرش پر بکھرا پڑا ہے
(گل جی کے لیے)

آبادی پر نظم، میرے بعد میں ''میر'' کا دکھ، سمٹتے پھیلتے نقطے، بہت ہی اعلیٰ نظم ہے اور طوالت میں عجیب سحر طرازی ہے:

درختوں پر بہت سے نام لکھے ہیں، ''نئے گھر میں پہلا دن'' اس کتاب کی نمائندہ نظم ہے:

ایک کمرے سے کشادہ گھر میں آنے تک
مجھے چالیس برسوں کا سفر کرنا پڑا ہے
میں اگرچہ خوش ہوں لیکن
میرا کمرے میں بہت کچھ رہ گیا ہے

.....

ہر سطر لاجواب ہے، بار بار پڑھی جانے والی۔ ''ایک چھتنار کے نیچے کھڑا ہوں''، ''لمحے کی تلچھٹ'' یہ مطلوبہ قبر نہیں ہے، وبا سے بچ گیا تو، ابھی رنگ گیلے ہیں، گلے میں لگا پودا، گل لالہ، تجاوزات، ڈیجیٹل لائف، مدتوں بعد کوئی بات ہوئی، عید اور کرسمس، منگ پرسن، سال نو کی رات اور شاعر و اپنی نظمیں واپس لے لو میں برما کے مسلمانوں کا دکھ، چڑیل نامہ، احتراماً ذرا سا جھک گیا ہوں، حمایت نہ کرو۔ یہ سب بہترین نظمیں ہیں۔ یہ کتاب تقریباً ستر نظموں پر مشتمل ایک خوشبودار گلدستہ ہے۔ جس کا انتساب ڈاکٹر شاہد اشرف نے اپنے (مرحوم) بھائی کے نام کیا ہے۔ شاعری ایسے ہی دکھوں سکھوں۔ کبھی تہی دامنی جیسی محسوسات کا مجموعہ ہے۔ جسے مثال پبلشرز نے بہت دیدہ زیب پیرہن میں زینت دی ہے۔

☆☆☆☆☆

غلام عباس.....عام آدمی کا ماہر نفسیات

امرتسر کی مردم خیز سرزمین پر جنم لینے والے غلام عباس نے اردو ادب کو چند ایسے فن پارے دیئے ہیں جن کی مثال سونے جیسی ہے کہ وقت کی تیز رفتاری بھی انھیں متاثر نہیں کر سکی۔ قدامت سے ان کی قیمت کم نہیں ہوئی بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کندن جیسے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا سبب افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں غلام عباس کی کمال سادگی اور انفرادیت ہے ۔ انھوں نے تیس اور چالیس کی دہائی میں رواجی افسانہ نویسی سے متاثر ہو کر نہ تو ایسے رومان پرور افسانے لکھے جو انھیں راتوں رات مشہور کر دیں اور نہ ہی ایسے فرمائشی قصے لکھے جو تخلیق کاری کے بجائے کسی پارٹی کی ہدایت کاری کا نتیجہ معلوم ہوتے ہوں۔ اس کے برعکس غلام عباس نے سیدھے سادے انداز میں کہانیاں لکھیں ۔ جن میں عام آدمی کے داخلی، خارجی، عائلی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی معاملات کو بڑے سلیس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ن۔ م۔ راشد نے انھیں عام آدمی کا داستان گو کہا ہے ۔ بلاشبہ غلام عباس کے افسانوں کا مرکز و محور عام آدمی اور اس کے مسائل ہیں۔ وہ عام آدمی کو فرشتوں کے پر لگاتے ہیں اور نہ ہی اسے فلمی ہیرو بناتے ہیں بلکہ اسے عام آدمی ہی رہنے دیتے ہیں جو مسلسل محنت اور جدوجہد کرتا ہے۔ جو زندگی کے اچھے دنوں کی آس میں جوا کھیلتا ہے۔ اپنا مشکل وقت آسان اور خوش حال زندگی کی چاہ میں ہنس کر کاٹ لیتا ہے۔ خود کو اور خود سے وابستہ تمام افراد کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے جیسے فقط یہی چند کڑے دن ہیں، ان کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ عام آدمی ایسا شریف آدمی ہے جو سوچتا ہے کہ بس یہ ذمہ داری پوری کر لوں پھر اس کے بعد اپنی فلاں خواہش پوری کر لوں گا مگر ایسا کرتے کرتے

مظفر اقبال

خواہش حسرت میں بدل جاتی ہے۔ یہ وہ عام آدمی ہیں جو کبھی کبھی جذباتی ہو کر برائی کا خاتمہ کرنے کی اس طرح سنجیدہ کوشش کرتے ہیں کہ اگر یہ ختم نہ ہوئی تو ان کی ناک کٹ جائے گی۔ یہ ایسے عام آدمی ہیں کہ اگر کبھی ان کے پاس فیصلہ کرنے کی قوت آ بھی جائے تو یہ بیک جنبش قلم سب اچھا کر دینے کی طفل تسلی اور وقتی ریاکاری سے زیادہ کچھ نہیں کر پاتے۔ یہ اس طرح کے عام آدمی ہیں جو بیوی کی بے وفائی کو بھی جیسے تیسے برداشت کر کے سمجھوتہ کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے عام آدمی بھی ہیں جو کولہو کے بیل کی طرح روزگار کے چکر میں اتنے برے پھنسے ہوتے ہیں کہ انھیں کسی رئیس کے پالتو جانور پر بھی سچ مچ رشک آنے لگتا ہے۔ یہ ایسے عام آدمی ہیں جو اپنی غربت اور اصلیت کو چھپانے کے لیے اوور کوٹ کا سہارا تو لیتے ہیں مگر یہ سہارا عارضی ثابت ہوتا ہے۔ یہ عام آدمی اپنی روزی روٹی کے لیے غیر ملکی افراد کو بھی چکر دے سکتے ہیں اور مصنوعی رنگ روغن سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ یہ ایسے عام اور بھولے آدمی ہیں کہ اگر غیر ملک میں تعلیم حاصل کر بھی لیں تو قومی خدمت کا جنون انھیں اپنے پیارے وطن میں آنے پر مجبور کر دیتا ہے مگر پیارے وطن کے حالات اور اس کی صورت حال سے دردمند دل کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ یہ وہ عام آدمی ہیں جو حقیقی زندگی کے دکھوں کو ڈرامہ کہتے ہیں اور ڈرامے میں دکھائے جانے والے غمگین قصے کو حقیقی سمجھتے ہیں۔ یہ عام آدمی اس قسم کے ہیں کہ تماشا دیکھتے دیکھتے خود تماشا ہو جاتے ہیں۔ کسی کا کیا دھرا انھیں بھگتنا پڑ جاتا ہے۔ کبھی یہ عام آدمی روزگار کے لیے طرح طرح کے بہروپ بدلتے ہیں تو کبھی کسی کو برائی کے بھنور سے نکالتے نکالتے خود چکر میں آ جاتے ہیں۔ یہ عام آدمی کبھی اپنے بچے کو اپنی نقل کرتے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں کبھی اپنی ذات اور قوم بدل کر خوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ وہ عام آدمی ہیں جو مستری مزدوروں کے چکر میں آ کر بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ عام آدمی ہیں جو اپنا شوق پورا کرتے کرتے ایک شریف آدمی سے ''فن کار'' بن جاتے ہیں۔ یہ عام آدمی ایسے ہم درد اور نیک صفت ہیں کہ کسی کو اکیلا نہیں دیکھ سکتے بالخصوص اکیلی اور بیوہ خاتون کے لیے ان کی ہمدردیوں اور نیک جذبات میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ عام آدمی اس کی تنہائی کو دور کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی شادی کے دن گھر سے فرار ہو جاتے ہیں اور ایک عرصے کے بعد دوبارہ آ جاتے ہیں۔ ان کے جانے کا پتا چلتا ہے نہ

آنے کا! ان میں ایسے عام آدمی بھی ہیں جو مل جل کر اپنا ہنر آزماتے ہیں کاروبار چمک جاتا ہے تو دل کے آئینے میں بال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مالک سے ملازم بن جاتے ہیں۔ ان میں ایسے عام آدمی بھی ہیں جو موقع پرست اور مصلحت شناس ہیں۔ انھیں موقع ملتا ہے تو بھولی بھالی اور نیم پاگل مخلوق کے ساتھ بھی زیادتی کرنے سے باز نہیں آتے اور جہاں تیز طرار لوگ ہوں وہاں یہ ہر طرح کے جبر کو سہنے اور شبہ شبہ بولنے کے لیے بھی خود بخود تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے عام آدمی بھی ہیں جو اپنے مالکان کے نام بگاڑ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو کسی کے ظلم کے خلاف رینگ رینگ کر آگے بڑھنے کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے عام آدمی بھی موجود ہیں جو محض ہجوم کا حصہ ہیں انھیں جہاں لگا دیا جائے وہاں لگ جاتے ہیں۔ پیچھے پیچھے چلنا اور نعرے بازی کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

عام آدمی کے ساتھ ساتھ جہاں تک عام عورتوں یعنی غلام عباس کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کا تعلق ہے یہ بھی عام آدمی کی طرح ہیں۔ یہ عام عورت کبھی ایک مرد سے بھی بڑھ کر کام کاج کرتی ہے اور اپنے گھر روزانہ کئی بن بلائے مہمانوں کی سیوا کرتی ہے۔ پھر کمائی کا جب ظاہری ذریعہ ختم ہو جاتا ہے تو باطنی ذریعہ اختیار کر کے ان کے اور اپنے پیٹ کا دوزخ بھرتی ہے۔ یہ ایسی عام عورتیں ہیں جو محنت مزدوری کر کے پیسے اور زیور جمع کرتے کرتے بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ جاتی ہیں لیکن اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کرنے سے خوف زدہ ہیں۔ یا پھر سماج کے سیاہ رو کردار انھیں اپنی پناہ گاہ میں سسک سسک کر جینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایسی عام عورت بھی ان افسانوں کا حسن ہے جس کا نام تو چراغ بی بی ہے مگر وہ بینائی سے محروم ہے۔ ایسے میں وہ خدمت اور محبت سے اپنی زندگی میں روشنی کر لیتی ہے۔ ایسی عام عورتیں بھی ہیں جو بظاہر تو طوائف ہیں مگر ان کی بابت فیصلے شہر کے معززین کرتے ہیں جو ریاکاری اور کج فہمی کے باعث نہ صرف مضحکہ خیز ہوتے ہیں بلکہ کبھی نتیجہ خیز بھی ثابت نہیں ہوتے۔ پھر ایسی عام عورت بھی ملتی ہے جو اپنے جیسی عورت کے ہاتھوں جگہ جگہ نہ صرف فروخت ہو رہی ہے بلکہ اس کی حیثیت اب محض اک کھلونے کی سی رہ گئی ہے۔ اکتاہٹ اور بے زاری کے باوجود وہ اس عمل کا حصہ ہے۔ یہ عام عورت کبھی اس کی بیوی کی جگہ پُر کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے تو کبھی اس سے بے وفائی بھی سرزد ہو جاتی ہے۔ غرض یہ کہ غلام عباس نے عام آدمی کے مسائل کو جس انداز سے پیش کیا

ہے وہ خاص انھی کا اسلوب ہے۔ انھوں نے افسانوں میں جزئیات نگاری کو بڑی خصوصی اہمیت دی ہے۔ منظر یا صورت حال کو دکھانے اور سمجھانے کے لیے جزئیات اور متعلقہ تفصیلات کو احاطہ قلم میں لانا ''عباسی تکنیک'' ہے۔ غلام عباس نے عام آدمی کی زندگی کا مشاہدہ اور اس کی نفسیات کا جائزہ بڑی مہارت سے لیا ہے۔ عام آدمی کی زندگی ایک شریف اور سادہ آدمی کی زندگی ہے جو جہد مسلسل کے بجائے جبر مسلسل سے عبارت ہوتی ہے۔ جہاں اسے قدم قدم پر اپنی جھوٹی انا اور عزت کے لیے طرح طرح کوششیں کرنا پڑتی ہیں جو اگرچہ سب کی سب سعی ناکام ہی ثابت ہوتی ہیں لیکن وہ پھر بھی زندگی سے سمجھوتہ کر کے اسے رینگنے والے کی مانند گزارتا رہتا ہے۔ یہ عام آدمی اپنے آپ سے اور اپنے اندر سے اور اپنے باہر سے ہمہ وقت نبرد آزما رہتے ہیں۔ سماج سے یہ کل لڑ سکتے تھے نہ آج جھگڑ سکتے ہیں۔ یہ تو محض زندگی گزارنے کی ایک بھونڈی سی نقل ہی اتارتے چلے آرہے ہیں۔ یہ شریف حسین کی طرح یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ بس اب خوش حالی گلی کا آخری موڑ مڑنے ہی والی ہے۔ لیکن آنکھیں تھک جاتی ہیں وہ گھر میں نہیں آتی ہے۔ آخر اسے ہی ہمیشہ کے لیے آبائی قبرستان میں ''آسودہ خاک'' ہونا پڑتا ہے۔ یہ عام آدمی خود فریبی کا شکار ہیں اکثریت طفیلیے حضرات کی ہے جو لہو گرم رکھنے کی جگہ پانی گرم رکھنے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ یہ جلسے جلوسوں میں نعرے لگا لیتے ہیں۔ ہر طرح کا سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ فضل، ریشماں، چیلا رام، مرزا برجیس، چکی بائی، میمونہ، بیگم تراب علی اور فیاض کی زندگی شکست خوردگی اور خود فریبی کا دوسرا نام ہے۔ ان کی زندگی زندہ دلی والی نہیں بلکہ بے دلی سے اٹی ہوئی ہے۔ ان کے چہرے اصلی نہیں بلکہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ سو سو قسم کے عذابوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ وہ بہروپیے ہیں جو اپنے اصل چہرے اور شناخت سے محروم ہو چکے ہیں۔ غلام عباس نے انھی عام آدمیوں کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور اس میں کمال کر دکھایا ہے۔ ''جواری'' سے لے کر ''اے فیملی افیئر'' تک انھوں نے عام آدمی کے مزاج اور اس کی نفسیات کو بڑی تفصیل اور تسلی سے بیان کیا ہے۔ آنندی، جاڑے کی چاندنی اور کن رس جیسے افسانوی مجموعوں کے خالق غلام عباس نے اگرچہ مجموعی طور پر صرف 39 افسانے لکھے ہیں لیکن ان افسانوں میں انھوں نے عام آدمی کی زندگی اور اس کی نفسیات کو اس قدر مہارت سے پیش کیا ہے کہ اگر انھیں عام آدمی کا ماہر نفسیات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

لندن کے لمحات: ہیتھرو ایئرپورٹ پر بی سی سی آئی کے نمائندے نے میرا استقبال کیا۔ ایک عمدہ سی لیموزین پر بٹھا کر وہ سیدھا ماربل آرچ ہلٹن میں لے آیا۔ بکنگ پہلے سے ہو چکی تھی۔ جب رجسٹر پر خانہ پری کے بعد ری سپشنسٹ نے مجھے کمرے کی چابی دی تو وہ رخصت ہونے سے پہلے ضروری معلومات بھی دے گیا۔ بولا ''آپ بی سی سی آئی کے خاص مہمان ہیں۔ جتنے دن ٹھہرنا چاہیں ٹھہر سکتے ہیں۔ کھانا، ناشتہ، سنیکس، ڈرنکس اور فون سب فری ہیں۔ بے دھڑک انٹرنیشنل کالز کریں۔ جی بھر کر مرضی کا کھانا کھائیں۔ حسب مزاج مشروبات سے لطف

اندوز ہوں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کریں۔

Everything is on the house and prepaid

ہوٹل کے کمرے دیکھے تو جی خوش ہو گیا۔ کشادہ، تمام ضروریات سے آراستہ، ٹی وی، فریج، ایئر کنڈیشنر، فروٹ باسکٹ، خستہ بسکٹوں سے لبالب بھری ہوئی طشتری۔ باہر کا ماحول بھی خاصا کشادہ لگتا تھا۔ سارا ایجویئر روڈ عربوں سے بھرا پڑا ہے۔ آدھی سے زیادہ جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہے۔ ہوٹل میں بھی انھی لوگوں کی اکثریت تھی۔ عام حالات میں ایک عرب بھائی کو شناخت یا تلاش کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ مخصوص لباس، ہاتھ میں تسبیح، پاؤں میں ہوادار چپل، بغل میں چھری نہیں بلکہ وہ رام کرنے والی مخلوق، ہنستی مسکراتی نخرے اور چہلیں کرتی ہوئی۔ منہ سے خوشبوؤں کے بھبکے۔ پنجابی زبان کا محاورہ ہے ''یاراں دے دو ہی ٹھکانے یا ٹھیکے یا ٹھانے'' ان کی دوڑ بھی پام بیچ کیسینو اور ہائیڈ پارک کی بڑی جھیل تک ہے۔ ایک دوست کہنے لگے ''اگر اسی رفتار سے یہ لندن میں جائیداد خریدتے رہے تو وہ دن دُور نہیں جب سارا لندن ان کی ملکیت قرار پائے گا۔''

عرض کیا ''انگریز بہت بڑا سوداگر ہے۔ اس دن پارلیمنٹ ایک قانون پاس کرے گی جس کی رو سے غیر ملکیوں کا جائیداد خریدنا اور بیچنا ممنوع ہوگا۔ کیا آپ نے ہیرڈز کے مالک الفہد کا قصہ نہیں سنا۔ اس نے چالاکی سے انڈر ہینڈ ڈیل کر کے سٹور تو خرید لیا لیکن ابھی تک شہریت حاصل نہیں کر سکا۔ ہر قدم پر کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کر دی جاتی۔ پھر اپنا پیارا بیٹا دودی الفہد بھی گنوا بیٹھا۔ غیر ملکیوں کو شاہی خاندان سے معاشقے کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ ادھر دودی اور ڈیانا پیرس کے رٹز ہوٹل سے نکلے تو ادھر M15 حرکت میں آ گئی۔ جاسوس اداروں کا یہی تو کمال ہے کہ قتل عمد کو بھی طبعی موت یا حادثے کی شکل دے دیتے ہیں۔''

بی سی سی آئی کے نمائندے نے مہمانوں کی خاطر مدارات والی جو بات کی تھی، نہ جانے کیسے احباب نے سن لی۔ ہر وقت کمرہ دوستوں سے بھرا رہتا لیکن دو شخص ایسے بھی تھے جنھوں نے وہاں مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے اور وہ کوئی غیر نہیں بلکہ بالکل اپنے تھے۔ میاں بشیر اور استاد اے جی جوش۔

میاں صاحب اٹلی والے میزبان کو بھگتا کر واپس لندن پہنچ چکے تھے۔ استاد کی آمد البتہ اتفاقیہ تھی۔ میاں صاحب چونکہ میزبانوں کی فراخ دلی سے خاصے واقف ہو چکے تھے اس لئے یہاں بھی انھوں نے کسی قسم کے تکلف سے کام نہ لیا۔ بڑے عرصے کے بعد میں نے انھیں زیرِ لب گنگناتے ہوئے سنا۔ اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر۔ اے جی جوش نے ہوٹل میں مستقلاً ڈیرے تو نہ ڈالے تھے بس دن میں صرف ایک بار آتے۔ یعنی صبح آٹھ بجے سے لے کر رات بارہ بجے تک۔ رُخصت ہوتے وقت کہتے ''رشتہ

داروں کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ آخر انھیں بھی تو کچھ وقت دینا ہی پڑتا ہے۔'' میاں بشیر ویسے تو سیکولر ذہن رکھتے تھے لیکن لندن آ کر کچھ کچھ اسلام پسند ہو گئے تھے۔ کہتے ان لوگوں کا کیا اعتبار ہے۔ حلال اور حرام میں تمیز نہیں برتتے۔ بکرے کے گلے پر چھری نہیں پھیرتے، کلہاڑا دے مارتے ہیں۔ اس لئے میں اس جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتا۔ چنانچہ گوشت کھانے سے اجتناب برتتے، البتہ سول مچھلی، ٹراؤٹ اور میکٹی بڑی رغبت سے کھاتے۔ ایسی ٹائیزر کے طور پر پرانز، اولیسٹرز اور کبھی کبھی لابسٹر پر بھی دست شفقت پھیر لیتے۔ چینی کے سخت مخالف تھے۔ کہتے یہ ام الخبائث ہے۔ بیک وقت ذیابیطس، اوبیسٹی (Obesity) اور کولیسٹرول پیدا کرتی ہے اس لئے صرف ڈائیٹ آئس کریم پسند کرتے جس پر ٹن فروٹ کی ڈریسنگ ہوتی۔ ایک دن توجہ دلائی کہ حضرت ڈبوں کا فروٹ بھی چینی کے شیرے میں تیار ہوتا ہے تو تقریباً ڈانٹتے ہوئے بولے'' لگتا ہے مجھے کچھ عرصہ تک تمھیں میڈیکل کے سائنسی اصول بتانا پڑیں گے۔ بھائی نیچرل شوگر اور سینتھٹک شوگر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پھل چاہے کتنا ہی میٹھا کیوں نہ ہو، اس کی مٹھاس زہر نہیں اکسیر ہے۔ طبیعت میں جوار بھاٹا نہیں اُٹھتا بلکہ وجود کو نکور کا احساس ہوتا ہے۔ اگر تم دیسی علاج کے قائل ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ حکیم جالینوس کے ہر نسخے میں شہد استعمال ہوتا تھا۔

لندن بڑا فرینڈلی شہر ہے۔ اہل ہندو پاک کو تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ دیار غیر میں ہیں۔ ہر طرف پگڑیوں، شلوار قمیضوں اور پاجاموں والے لوگ مل جاتے ہیں۔ لندن میں بھاجی، بھاجی کی آوازیں بڑی سہانی لگتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ گندے انڈے ہر کہیں ہوتے ہیں اور یہ شہر بھی ان سے پاک نہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ زیادہ خرابی ہمارے اپنے لوگ کرتے ہیں۔ پیرس اپنی آرٹ گیلریوں اور میوزیموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ جرمنی میں صاف کشادہ سڑکیں ہیں۔ مین ہٹن کی عمارتیں آسمان کو چھوتی نظر آتی ہیں لیکن وہ لندن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جس طرح غیر ملکی یہاں سکون اور راحت محسوس کرتے ہیں وہ اور کہیں نہیں ہے۔

چنانچہ ہم نے ازسرِ نو لندن دریافت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اس کے مشہور مقامات نہ دیکھے تھے۔ دراصل میاں صاحب تاریخ کی روشنی میں ان حقائق سے پردہ اُٹھانا چاہتے تھے جو ہمیں کم علمی کی وجہ سے معلوم نہ ہو سکے تھے۔ دو ماہ کے قلیل عرصہ میں انھوں نے اس شہر خرابات کی تاریخ، جغرافیہ اور کلچر کھنگال ڈالا تھا۔ میوزیم، پبلک لائبریری دیکھتے ہوئے جب لندن ٹاور پہنچے تو میاں صاحب پھٹ پڑے۔ غضب خدا کا! ہندوستان کی کون سی قیمتی چیز ہے جو لوٹ کر یہ لوگ انگلستان نہیں لائے۔ ہیرے جواہرات، نادر قلمی نسخے، ہزاروں

سال کے پرانے مجسمے اگر ان کا بس چلتا تو تاج محل آگرہ اور دہلی کا شاہی قلعہ بھی کھود کر یہاں لے آتے۔ اب کوہِ نور ہیرے کو ہی دیکھو۔ یہ محض ایک قیمتی پتھر نہیں بلکہ شاہی خاندان کی شناخت تھا۔ اُٹھا کر شاہی تاج میں ٹک دیا۔ انھیں شرم نہیں آتی کہ ملکہ کو مال مسروقہ پہنا دیا ہے۔ اگر کسی نے تاریخ آزادی پر ریسرچ کرنا ہو تو بھی یہاں آنا پڑتا ہے۔ ان گلی کوچوں میں کچھ نہیں رکھا جہاں پر شمع آزادی کے پروانوں کا خون بہا تھا۔ مہاتما بدھ بھی یقیناً اپنی سادھی میں کلپ رہا ہوگا کہ اسے کھلی فضاؤں سے اُٹھا کر یخ بستہ عمارتوں میں قید کر دیا گیا ہے۔

عرض کیا ''جبھی تو یہ نوادرات محفوظ ہیں۔ کتابیں اگر یہاں نہ ہوتیں تو انہیں کب کی دیمک لگ چکی ہوتی۔ ان کے اوراق پریشان نہ ہوتے، فگار ہوتے۔ باقی رہی ہیرے کی بات۔ تو اس کی بھی بندر بانٹ ہو چکی ہوتی۔ اب تک یہ اپنی سالمیت اور انفرادیت کھو چکا ہوتا۔ اس کو نادر شاہ لوٹ کر کابل لے گیا تھا۔ ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتا ہے ایک لے گیا یا دوسرا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''پڑتا ہے'' وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے بولے۔ ''اپنے اپنے ہوتے ہیں اور غیر غیر۔ وہ تھا تو اپنا ہی بھائی بند۔ میری مراد اس کی مسلمانی ہے۔''

عرض کیا ''وہ بھی تو بھائی تھا جس نے تخت کی خاطر تمام بھائیوں کو مروا دیا تھا۔ باپ کو قیدِ تنہائی میں رکھا تھا اور اپنی اولاد تک کو محض شک کی بنا پر گرفتار کیا تھا۔''

زچ ہو کر بولے ''گھر کے جھگڑے تو پھر بھی گھر کے جھگڑے ہوتے ہیں۔ اگر دو بھائی آپس میں لڑ پڑیں تو محض ایک بات ہے۔ لیکن کوئی باہر سے آ کر ان دونوں کو پھینٹی لگا لے تو یہ بڑی شرم ناک حرکت ہوگی۔''

جوش بڑی دیر سے یہ بحث سن رہے تھے۔ ریفری کے فرائض سنبھالتے ہوئے کہنے لگے ''اس طویل بحث سے، جو در حقیقت تو تکار ہے، میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں اور وہ یہ کہ تم دونوں کو سخت بھوک لگی ہے۔ چلو ہوٹل میں پہنچ کر سول مچھلی کھاتے ہیں۔''

Every dog has his day

ایک شام افضل حسین تارڑ آ گئے۔ کہنے لگے ہوٹل کی بغل میں ڈکٹور یہ کیسینو ہے۔ یہ لندن کے چند بڑے جوا خانوں میں سے ایک ہے۔ یہ لوگ میرے بڑے مداح ہیں۔ ویسے بھی ان سے دیرینہ مراسم ہیں، آپ لوگ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ پام بیچ کو بھول جائیں گے۔ پام بیچ چھوڑ ہم قریباً سب کیسینوز کو بھلا چکے تھے۔ ان کے بورڈ پڑھ کر ہی دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور ہم نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ یہ ماہیئت قلب تھی یا پتہ نہیں کیا تھا۔ جہاں تک بھائی افضل حسین کی پاپولیرٹی کا تعلق تھا انھوں نے درست فرمایا تھا۔ ان کی دھاک ویگس تک بیٹھ چکی تھی۔ اس قسم کے کرم فرماؤں کے دم سے ہی تو کیسینو چلتے ہیں۔ افضل حسین سال میں دو تین

بار لندن ضرور آتے۔ بالخصوص چاول اور گندم کی فصل کٹتے ہی ان کے خون میں کھولن اُٹھتی اور دل قدموں سے پہلے چل کر کوئے ملامت جا پہنچتا۔

رات کو افضل حسین ہمیں لینے آ گئے۔ ہم پیدل چل کر ہی وہاں پہنچ گئے۔ کیسینو کے عملے نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی آؤ بھگت کی۔ کھانے کے لیے اسپیشل میبل لگوایا گیا تھا۔ لندن کی ہر قابل ذکر ڈش موجود تھی۔ بیرا گیری کے فرائض بھی مرد نہیں بلکہ حسین اور جوان لڑکیوں نے سنبھال رکھے تھے۔ جب وہ ہونٹوں پر ایک کاروباری مسکراہٹ سجائے Anything more, Mr. Hussain کہتیں تو وجود میں گدگدیوں کا احساس ہوتا۔ کھانے سے پہلے ہمیں خاص مشروبات کی پیشکش بھی کی گئی جو بوجوہ ہم نے قبول نہ کی۔ البتہ انار جوس کے چند گلاس غٹا غٹ پی گئے اور اس کے ساتھ ہی بھنے ہوئے کاجو اور باداموں کی پلیٹیں بھی صاف کر ڈالیں۔

کھانا شروع ہوا تو افضل حسین نہ کچھ کھا رہے تھے نہ پی رہے تھے۔ خوبصورت میزبانوں سے بھی بظاہر بے نیاز نظر آتے تھے۔ ان کی نظریں سامنے بانکو پانٹو کے ٹیبل پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کھانا کھا کر اجازت چاہی تو بولے "اتنی جلدی! کیا چند بازیاں نہیں لگانی ہیں؟"

عرض کیا "ہم ان دنوں بڑے خوشگوار موڈ میں ہیں۔ لندن سے پیار محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اس بزم سے پریشان ہو کر نکلیں۔"

کہنے لگے "پریشانی میں بھی ایک خاص لطف چھپا ہوتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو حریص لذت آزار ہوتے ہیں۔ اُردو اور انگریزی میں اس کیفیت کے لیے کئی اصطلاحیں ہیں لیکن یہ وقت بحث کا نہیں عمل کا ہے۔ وہ کسی نے درست ہی کہا ہے "Time is money-"

"Money for Whom?" کاش وہ اس کی وضاحت بھی کر دیتا۔ بہر حال "Wish you good luck" ہم ان سے ہاتھ ملا کر کیسینو سے باہر نکل آئے۔

کیسینو کے اندر اور باہر بے شمار حسینائیں شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتی رہتی ہیں۔ ان کی نظریں جواریوں کے چہرے پر نہیں جیب پر ہوتی ہیں۔ یہ اس قدر ماہر ہیں کہ انھیں اس کی چال ڈھال سے پتہ چل جاتا ہے کہ جیت کر آیا ہے یا ہار کر! اگر جیتا ہے تو کس قدر اور اگر لٹیا ڈبو آیا ہے تو کیا غم غلط کرنے کے موڈ میں ہے یا اٹوائی کھٹوائی لے کر لیٹ جانا چاہتا ہے۔ جونہی جواری باہر نکلتا ہے یہ اس کو اس طرح جھپٹتی ہیں جس طرح کرکٹ کا بال پکڑا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے، مضبوطی کے ساتھ، بغیر قلابازیاں کھائے، عام طور پر کیسینو انھیں اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ کھلاڑیوں کے انہماک میں خلل پڑتا ہے

اور کاروبار بھی متاثر ہوتا ہے۔
وہ حسبِ دستور گیندیں پکڑ رہی تھیں کہ میاں صاحب کسمسائے۔ کمال ہے۔ انھوں نے حسرت سے ایک آہ کھینچی۔ ہم بھی اسی کیسینو سے نکل کر آ رہے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ہائے ہیلو نہیں کرتا۔ انھیں کیسے پتہ چل گیا ہے کہ ہمارے بٹوے خالی ہیں۔
''یہی تو کمال فن ہے۔'' جوش بولے
''کاش! آپ نے مشرقی شاعری کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا۔ چال سے سب پتہ چل جاتا ہے۔ یہ کڑی کمان کا تیر بھی ہے اور لنگڑے کی لاٹھی۔ پھر ذرا ہماری اپنی عمر تو دیکھیں۔ کاش آپ جوانی میں یہاں آئے ہوتے۔ Every dog has his day استاد مسکرائے۔

ہندو شاعر ورمانی کے ساتھ ایک شام:

ان دنوں لندن میں ایک مشہور ہندو شاعر مسٹر ورمانی رہا کرتے تھے۔ قتیل شفائی کے بڑے دوست تھے۔ کیونکہ دونوں بمبئی جا کر ہندوستانی فلموں کے لئے گیت لکھتے۔ جب سے ضیاالحق نے انگور و گلاب پر پابندی لگائی اور اس سلسلے میں شرعی حد قائم کی تو قتیل صاحب نے زیادہ وقت ہندوستان میں گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اتفاق سے جب حد کا ٹی وی پر اعلان ہو رہا تھا تو میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ بار بار ایک ہی لفظ کو دہراتے۔ حد ہی ہو گئی! غالباً قتیل صاحب نے جوش کو ان کا فون نمبر دیا تھا۔ جوش نے فون کیا تو فوراً ہوٹل میں آ گئے۔ عمر کافی ہو چلی تھی لیکن جوانی میں یقیناً خوبصورت رہے ہوں گے۔ ساؤتھ ہال میں رہتے تھے۔ بچے جوان ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے تھے۔ اس لئے میاں بیوی اپنے بڑے مکان پر اکیلے رہتے تھے۔ انھوں نے ہمیں شام کو کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ رات کو وہ ہمیں اپنی کار میں گھر لے گئے۔ گھر نفاست اور امارت کا آئینہ دار تھا۔ ان کی دو بیٹیاں انڈین ایئر لائن میں ایئر ہوسٹس تھیں۔ بیٹا کسی بڑی فرم میں ایگزیکٹو تھا۔ شاعر لوگ عموماً تنگ دست ہوتے ہیں۔ شاہوں، عالم پناہوں اور قبلہ گاہوں کی تعریف کر کے گزارا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار اگر روزی میں رکاوٹ آ جائے تو ایک آدھ ہجو بھی جڑ دیتے ہیں۔ یہ ہتھیار عام طور پر تو شعرا نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کے لئے مختص کر رکھا ہے، کبھی کبھار دوسرے بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں ہجو کے معنی گالی گلوچ کے ہوتے تھے۔ جیسے کسی نے ان شاءاللہ خان کو کہا تھا۔ واللہ کہ تو شاعر نہیں بھانڈ ہے بھڑوے۔
ان دنوں دفعہ ۵۰۰ تعزیرات پاکستان یا Law of libel نہیں تھا اس لئے کچھ دریدہ دہنی کے باوصف سب بچ نکلتے۔ ویسے بھی قرقی کی صورت میں گھر سے نکلنا کیا تھا! چند تصویر بتاں کچھ حسینوں کے خطوط۔ یہ نحیف و نزار لوگ اتنے تگڑے بھی نہیں ہوتے کہ ڈانگ سوٹا لے کر ایک دوسرے کا سر پھوڑ سکیں۔ اس سلسلے میں مصطفیٰ زیدی نے نئی روایت قائم کی اور اس صنف کو تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے کمالِ فن تک پہنچا دیا۔ نوکری سے

برخاست ہونے کے بعد جب انھوں نے مارشل لا کے کارپردازوں کے خلاف مزاحمتی نظم "بہ نام وطن" لکھی۔ لیل و نہار کے مدیر سبط حسن نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا تو وہ کہہ اُٹھے۔

زیرِ عتاب ہیں میرے اشعار دیکھنا
سبط حسن کی جرأت اظہار دیکھنا
صرصر کی زد میں آ کے بھی روشن ہے ایک چراغ
بجھنے لگے ہیں ثابت و سیار دیکھنا

ان قاتلوں کے رقص سر عام کے حضور
ان عاقلوں کا حجلہ پندار دیکھنا
پڑھنا بلند بانگ و رجز خواں ادا لئے
اور بعد میں نمونہ کردار دیکھنا

.....

اپنے کسی ساتھی افسر کے متعلق لکھتے ہیں:

ذات جیسے گناہ سڑتے ہوں
بات جیسے گنوار لڑتے ہوں

.....

ورمانی صاحب سے کافی دیر گپ شپ رہی۔ ہم نے ان کا کلام بھی سنا۔ استاد جوش کب پیچھے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بھی اپنی بیاض کو تھپتھپاتا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ اس محفل میں دو شاعر اور دو ہی سامعین تھے۔ میرے علاوہ میاں بشیر صاحب کو بھی کلام بھگتنا پڑ رہا تھا۔ میاں صاحب شعر و شاعری کے رسیا نہیں ہیں۔ انھوں نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کے کان میں سرگوشی کی There are no free lunches حقیقت یہ تھی کہ دونوں اچھی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ میاں صاحب کی لاتعلقی مشاعرہ جمنے نہیں دے رہی تھی۔ ایک شاعر کو آپ معقول معاوضہ دیں یا نہ دیں، کھانا اچھا ہو یا برا، داد ضروری ہے۔ یہی اس کی خوراک ہے یہی اس کا اعزاز یہ ہے۔ شاعر بھوک سے نہیں مرتا، غزل کی داد نہ ملے تو پرلوک سدھار سکتا ہے۔ پتہ نہیں انگریز کس طرح مشاعرہ کرتے ہیں۔ داد ملتی بھی ہے یا نہیں! کچھ بھی ہو وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ذرا ان الفاظ کا انگریزی میں ترجمہ تو کر کے دکھائیں۔ سبحان اللہ! واہ! اماں مکرر فرمایئے۔ واللہ جان غزل شعر پڑھ ڈالا ہے۔ ایک مرتبہ پھر عنایت فرمائیں۔ واہ! مشاعرہ لوٹ لیا ہے۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ ڈھاکہ میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ جنرل اعظم خان گورنر مشرقی پاکستان مہمان خصوصی تھے۔ ایک شاعر نے جاندار غزل پڑھی تو ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے۔ مکرر! مکرر! کہتے ہوئے لوگوں کی زبان نہ تھکتی تھی۔ شاعر بھی لہک لہک کر مصرع دہرا رہا تھا۔ کچھ دیر تو خان صاحب حیرت سے وہ منظر دیکھتے رہے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے سرکاری افسر سے پوچھا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بولا۔ عالی جاہ! یہ ایک ہی شعر کو بار بار پڑھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس پر خان صاحب کا پیمانہ

صبر لبریز ہو گیا۔ اُٹھ کر مائیک پر آئے اور اپنا فوجی ڈنڈا کھڑکاتے ہوئے سامعین کو ڈانٹا۔ ''خوچہ شعر سمجھ نہیں آتی ہے تو آیا کیوں ہے؟'' ایک دم خاموشی چھا گئی۔ دم بخود لوگوں نے اس قہر خداوندی کو دیکھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور پتلون کی دونوں جیبوں میں پستول تھا۔ مارشل لا جو لگا ہوا تھا۔

نصف شب کے قریب دونوں کو میاں صاحب کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ اس میں کچھ مدد ورمانی صاحب کی بیگم نے بھی کی۔ انھیں کہنے لگیں ''کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے کیا آج مہمانوں کو غزلوں پر ہی ٹرخاؤ گے۔'' ہنس کر کہنے لگے ''دراصل یہ کم بخت چیز ہی ایسی ہے کہ وقت کا احساس نہیں رہتا۔ غالباً اسی لئے ہٹلر نے کرکٹ میچ اور شاعری پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔''

بولیں ''کاش! تم لوگ وہاں ہوتے کم از کم یہودی تو قتل عام سے بچ جاتے''

کھانا بڑا مزیدار تھا۔ ہندو سبزیاں اور دالیں پکانے کے ماہر ہیں۔ پراٹھے بھی خاص انداز سے ہیں۔ عام طور پر ان کے ہاں گوشت نہیں پکتا لیکن ورمانی صاحب نے مرغ اور مٹن نہ صرف پکایا تھا بلکہ جی بھر کے کھایا بھی تھا۔ شاعروں کا مذہب بھی منفرد ہوتا ہے۔ غالب نے کلکتہ میں انگریز مجسٹریٹ کو بتایا کہ وہ آدھے مسلمان اور آدھے کافر ہیں۔ یعنی شراب پیتے ہیں سؤر کا گوشت نہیں کھاتے۔ ورمانی صاحب بھی آدھے ہندو اور آدھے مسلمان لگتے تھے۔

یہ ایک رسم بن گئی ہے کہ کھانے کے بعد کچھ ہلکی پھلکی باتیں ہوتی ہیں جنھیں After dinner jokes کہا جاتا ہے۔ چرچل اس فن میں یکتا تھے۔ (مرحوم) مشتاق احمد گورمانی کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ اپنے لطائف سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتے تھے۔ ورمانی صاحب کو جو تازہ تازہ بیگم صاحبہ سے ڈانٹ کھا چکے تھے، لتاڑنے کا اتفاقاً موقع مل گیا۔ باتوں باتوں میں خوبصورتی کا ذکر چھڑا تو بولے۔ ہم شادی کے بعد ہنی مون منانے بنکاک گئے۔ کاش! آپ میری دھرم پتنی کو جوانی میں دیکھتے تو شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ایک آدھ غزل کہہ ڈالتے۔ شاہ صاحب! پہلی مرتبہ بنکاک دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے اور وہ بھی جوانی میں۔ آدمی وہ تجربات ساری زندگی نہیں بھولتا۔ ہمارا تو ایسا اچانک ہوا کہ دوستوں کو اس کی اطلاع نہ دے سکا۔ چنانچہ بنکاک میں جو دوست بھی ملتا وہ پہلی نظر میری دھرم پتنی پر ڈالتا اور دوسری بھی اسی پر ڈالتے ہوئے ہلکی سی چٹکی لیتا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہتا ''زبردست معشوق لائے ہو۔'' جب میں انھیں بتاتا کہ یہ میری بیوی ہے تو یک دم ان کا لب و لہجہ بدل جاتا۔ سرزنش کرتے ہوئے کہتے ''لخ لعنت ای۔ بنکاک وچ بیوی نوں لے آیاں'' (تم پر ہزار لعنت ہو۔ بنکاک میں

بیوی کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے) ان کی بیگم بڑھاپے کے باوجود شرما گئیں۔ ہلکی سی سرخی ان کے رخساروں پر نمودار ہوئی۔ ورمانی صاحب اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے "یہاں تک تو قابل برداشت تھا لیکن ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ غلطی سے اسے پیٹ پانگ لے گیا۔ وہاں پر ایک دلال میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ بار بار ترغیب دے رہا تھا کہ میں مساج کراؤں۔ مساج کرنے والی لڑکی کی شان میں اس کم بخت نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ سکہ بند رٹے رٹائے جملے، پیشہ ورانہ انداز بیاں۔ ایک بے حیا سی مسکراہٹ۔ بولا "دیکھنے میں حور شمائل، بالی عمریا یعنی پندرہ سال ایک دن کی۔ انگریزی فرفر بولتی ہے۔ سرو قد، سرخ و سفید رنگت۔ ناک نقشہ آدھا یورپین آدھا تھائی۔ بالکل کسی امریکی فوجی کی اولاد لگتی ہے۔ یہ کم بخت بے شک ویت نام میں جنگ ہار گئے تھے لیکن اس محاذ پر بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ میں تو کہتا ہوں ویت نام کو تھائی لینڈ کا مشکور ہونا چاہیے۔ امریکیوں کی شکست میں ہم نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔" حس مزاح بھی آج کل پروفیشنلزم کا ایک جزو بن گئی ہے۔ میں اسے ٹالتا رہا لیکن وہ باز نہ آیا اور ہمارے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ترغیب دیتا رہا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا "کچھ تو خیال کرو میری بیوی مرے ساتھ چل رہی ہے" وہ جھٹ سے بولا

"تو پرابلم! اس کے مساج کا ہم الگ سے بندوبست کر دیتے ہیں۔"

میرے کانوں میں خطرے کی تمام گھنٹیاں بیک وقت بجنے لگیں۔ میں نے بیگم سے کہا۔ نیک بخت یہاں سے نکلنے والی بات کرو۔

They have reached you

ہنس ہنس کر ہم سب کا برا حال ہو گیا۔ کھانے کے بعد وہ ہمیں ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔ جب کار چلی تو جوش مسز ورمانی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے "ورمانی صاحب نے آج آپ کے حسن کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہت کم خاوند ہیں جو اس طرح کی مدح سرائی کرتے ہیں۔"

"نہ ہی کرتا تو بہتر تھا۔" وہ جوش کے طنز کو بھانپتے ہوئے بولیں۔" **I take it as a left handed compliment** ویسے کھلا کبھی کبھی ہے۔ پتہ نہیں آپ لوگوں نے اسے کیا پلا یا سونگھا دیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ ان کی محبت اور مہربانی ہے۔ پرانی قدروں کے امین یہ تاریخ ساز لوگ ہیں۔ بغیر جان پہچان کے اس قدر وقت دینا انھی کا کام ہے۔ یہاں تو عزیز رشتہ دار جان چھڑانے کے لئے طرح دے جاتے ہیں۔" ہوٹل پہنچ کر ہم نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔ پتہ نہیں ورمانی اس وقت کہاں ہوں گے! قید حیات کاٹ رہے ہوں گے یا زندگی کو الوداع کہہ دیا ہوگا۔ ان کی یاد آج بھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔

[جاری ہے]

پاکستانی غزل 2010 کے بعد

میں زندگی کو ابھی نظم کر نہیں پایا

شاعرِ امروز

برار شاہ

شاہد ماکلی

برار شاہ کی تخلیقی ذہانت اور تازہ کاری حد درجہ حیران کُن ہے۔ ان کی غزل فنی اور فکری ہر دو سطح پر مضبوط اور ثروت مند ہے۔ ان کی شعری سلیقہ مندی غماز ہے کہ انھوں نے کلاسیکی شعریات کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ زبان و بیان پر ان کی دستگاہ نے ان کے اظہاریے میں بلاغت اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ ان کی غزل مسلسل ارتقا کے عمل سے گزر رہی ہے۔ جدید طرزِ احساس کی ارتقائی کارفرمائی ان کی غزل کو انفراد کی طرف لیے جا رہی ہے۔ برار شاہ 12 نومبر 1999 کو تلمبہ میں پیدا ہوئے۔ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد سے اپلائیڈ کیمسٹری میں گریجوایشن کی۔ 2017 سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ذیل میں ان کا مختصر سا شعری انتخاب:

آپ بھی آئے ہیں کسی کی جگہ
کل کوئی آپ کی جگہ ہو گا

میرا چہرہ پرانے وقتوں میں
رائگانی کا قافیہ ہو گا

اِس طرح دیکھ نہ بھرپور توجہ سے مجھے
تجھ کو مامور نہ کر لوں میں نگہبانی پر

میں کھلا دشت پہ اور دشت کھلا مجھ پہ برار
مل کے حیرت ہوئی ویرانی کو ویرانی پر

نقوشِ چہرۂ شب سے جدا دکھاتا ہے
مرا چراغ مجھے کچھ نیا دکھاتا ہے

یہ کون ہے پسِ نظارۂ حیات برار
جو ہم کو پہلے سے دیکھا ہوا دکھاتا ہے

میں پانیوں کے تصرف سے کھینچ لایا اسے
کہ اک سراب تھا مہتاب ناسپاس مرا

میں زندگی کو ابھی نظم کر نہیں پایا
ابھی قرینِ تخیل نہیں قیاس مرا

دُھند کے سمندر میں، رات مجھ سے ٹکرایا
آدمی تھا یا سایہ، میں نہیں سمجھ پایا

ابھی میں ٹھیک سے خود کو نظر نہیں آیا
ذرا چراغِ تعلق کی لَو بلند کرو

میں اپنی لو کو اٹھائے ہوئے ترے ہمراہ
جہانِ ثابت و سیار سے نکلنے لگا

تیرگی کا خیال آنے پر
تیر کھینچا چراغ خانے پر

شبِ سیاہ، ہتھیلی پہ اک چراغ لیے
اتر رہی ہے تری یاد کا سراغ لیے

کسی کو ہم نے ستارے دیئے تھے تحفے میں
کسی سے ہم نے نشانی میں صرف داغ لیے

آنکھ پُرشور تھی کنارے پر
اور دریائے دل سکوت میں تھا

اس نے کچھ سوچ کر کہا ہو گا
ہم نے مطلب غلط لیا ہو گا

ڈھونڈنے چل پڑا ہوں میں خود کو
اور یہ آخری دفعہ ہو گا

یار مجھ کو نکالو وحشت سے
یار کوئی تو راستہ ہو گا

تو جس کو کہہ رہا ہے: پرانا لگا مجھے
یہ گھر خریدنے میں زمانہ لگا مجھے

اپنے بھیدوں کا کچھ ادھورا پن
میری تکمیل میں کہیں رکھ دے

وہ عکس جب سرِ آئینہ رُو پذیر ہوا
میں دیکھ ہی نہیں پایا جمالِ آئینہ

مکینِ حجلۂ حیرت سرا رہے ہم لوگ
کبھی تو عکس، کبھی آئینہ ہوئے ہم لوگ

نمود پانے لگے ہیں تری نگاہوں سے
بدن کے قریۂ گم نام میں پڑے ہم لوگ

کہیں کہیں سے بدلتے ہیں خستہ پیراہن
لباسِ زندگی سارا نہیں بدلتے ہم

ہمارے عزم سے واقف ہے گردشوں کا غبار
جو چل پڑیں تو ارادہ نہیں بدلتے ہم

اس گلِ سبز کے تعاقب میں
ہر خزاں سے گزرنا پڑتا ہے

ہم جہاں سے نہیں گزرتے تھے
اب وہاں سے گزرنا پڑتا ہے

اک طرف آگ اک طرف تم ہو
درمیاں سے گزرنا پڑتا ہے

☆☆☆☆☆

پاکستانی غزل 2010_ کے_

ہر چیز اچانک مرے امکان میں آئی

شاعرِ امروز

حمزہ یعقوب

شاہد ماکلی

حمزہ یعقوب کی غزل اپنے آپ سے متصادم روح کا ارتقائی دریافت نامہ ہے۔ گذشتہ سوا سال (مارچ 2021) سے اب تک تخلیق ہونے والی ان کی شاعری دیکھ لیجیے اور اس کا موازنہ اس عرصے سے پہلے کی شاعری سے کیجیے تو آپ شاعر کی باطنیت میں وقوع پذیر ہونے والی تخلیقی و فکری کایا پلٹ دیکھ کر حیران ہو جائیں گے۔ ایک تخلیق کار کی ذات کے نہاں خانے میں کیسے کیسے روشن اور تحیر انگیز امکانات چھپے ہوتے ہیں اور وہ مخفی امکانات کس طرح کسی انکشافی لمحے کی حاقتور کائناتی لہر سے ہم آہنگ ہو کر ظاہر ہوتے ہیں--- یہ سمجھنے کے لیے آپ حمزہ یعقوب کی حالیہ شاعری کا مطالعہ کریں۔ آپ حمزہ کی شعری قلب ماہیت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور ان کی تازہ غزلوں اور نثری نظموں کے پیچھے کارفرما افتادِ طبع اور ایک فعال دماغ کی اختراعی ارتقا پذیری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ بلاشبہ کسی پوشیدہ امکان کا ہونا ہمارے اندر ایک بیج کی طرح ہوتا ہے جو سازگار آب و ہوا کے ملنے؛ اور اندر باہر کے موسموں کے مابین خاص فریکوئنسی قائم ہو جانے پر ایک پورا درخت بننے کی فطری قوت رکھتا ہے۔ حمزہ یعقوب کی تخلیقیت کا امکانی اکھوا بھی ان کے باطن سے پھوٹ کر ایک تناور شجر بننے تک کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اشعار و قیاس کے آئینے میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ امکانی شجر کیسا شاخ دار ہو رہا ہے؛ کیسے اس کی ٹہنیاں بُور اٹھا رہی ہیں اور کس طرح ان ٹہنیوں پر نئے ذائقوں کے پھل اور نئے رنگوں کے پھول آ رہے ہیں۔

حمزہ یعقوب 1999 کو مظفر گڑھ کی بستی روہیلانوالی میں پیدا ہوئے۔ اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ گذشتہ ایک سال سے بداپیسٹ ہنگری میں سائیکالوجی کے شعبے

میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ذیل کا شعری انتخاب غزل کے قاری سے سنجیدہ قرات کا تقاضا کرتا ہے۔

شناخت سب سے بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے
میں چاہتا ہوں، کسی شے کا کوئی نام نہ ہو

ترے غبار نے میری چمک گھٹا دی ہے
ہوا چلے گی تو پھر سے نیا لگوں گا میں

جب تو نہیں تھا، تب بھی کئی لوگ دل میں تھے
یہ صفر کائنات کا پہلا عدد نہیں

میں پڑھ چکا ہوں سارے جہاں کے علوم بھی
دُنیا مرے مزاج کی پہلی کتاب ہے

سوکھتا جا رہا ہے ٹہنی پر
پھول کو توڑ ہی لیا جائے

دنیا کو اس کی اپنی کثافت ڈبو گئی
میں بچ گیا کہ مجھ کو سہارا خلا کا تھا

حقیر چیز کبھی خاک میں نہیں ملتی
یہ حال صرف کسی منتخب کا ہوتا ہے

چھوٹے زندان سے نکلا تو بڑے میں پہنچا
ہر نئی قید کا آغاز رہائی سے ہوا

تمام لوگ یہاں خودکشی نہیں کرتے
کسی کسی کو خدا کا سہارا ہوتا ہے

معاشیاتی ترقی بھی کیا ترقی ہے
تمھارا فائدہ ، میرا خسارا ہوتا ہے

تجھے شکست ترے دوست کی مدد سے دی
درخت کے لیے لکڑی کا آرا ہوتا ہے

ہمیں پتہ ہے کہ کڑوا ہے سچ مگر حمزہ
ہم اپنے لہجے کو میٹھا تو کر ہی سکتے ہیں

میرے لیے وہ نیلگوں آنکھیں ہی ٹھیک ہیں
اپنے لیے الگ کوئی زندان دیکھ لو

کیا جانیے کب دیدۂ حیران میں آئی
ہر چیز اچانک مرے امکان میں آئی

کیا ہو گیا، دشمن کو اگر دل میں جگہ دی
الحاد کی آیت بھی تو قرآن میں آئی

شعاع میری توقع سے بھاری ہوتی تھی
میں آئنہ تھا، مجھے بے قراری ہوتی تھی

ہمیشہ تیسرا حصّہ خدا کی رہ میں دیا
ہماری چوری میں ایمانداری ہوتی تھی

پھر ایک پھونک سے اس نے بجھا دیا ورنہ
مری چمک تو زمانوں پہ طاری ہوتی تھی

کشتی سے پتہ کیجیے دریا کے معانی
ملاح نہیں جانتے گہرائی ہماری

تھوڑی سی خیانت بھی اگر بھول کے کر لیں
چھن جاتی ہے ہم سے سخن آرائی ہماری

میں پیڑ سے لے کر پتھر تک، ہر شے کی قیمت جانتا تھا
دنیا کی کوئی بھی چیز مجھے بیکار نظر نہیں آتی تھی

میں دُکھی ہوں کہ میں ساری دنیا سے لاعلم ہوں
کیا وہ خوش ہے جسے اپنے ہونے کا ادراک ہے؟

کھل کے رو دینے کی نوبت ہی نہیں آئی کبھی
پہلے ہی آنسو نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا

سب جانتے تھے، ہر سکے کا اک دوسرا رخ بھی ہوتا ہے
تاریکی کو بھی روشنی کا امکان بنا دیا جاتا تھا

شروع ہونے کا مطلب ہی اختتام نہ ہو
مری شکست کہیں تجھ سے انتقام نہ ہو

مجھے تو دل نے عجب وسوسوں میں ڈال دیا
شکست و ریخت کسی طرز کا کلام نہ ہو

مجھے سمجھ نہیں آتی، تُو کیسے بچ نکلا
ہرا اشارہ تو پوری قطار کھینچتا ہے

درخت مفت میں سیراب ہوتے رہتے ہیں
پہاڑ اپنے لیے آبشار کھینچتا ہے

ہمارے دل میں تو پہلے نہیں تھی اتنی جگہ
یہ کائنات کوئی بار بار کھینچتا ہے

رفتار جتنی تیز رکھو ، کوئی حد نہیں
میں روشنی ہوں ، مجھ کو کسی سے حسد نہیں

حالات ایک سے نہیں رہتے، یہ جھوٹ ہے
ہم آج بھی ہیں بے سر و سامان، دیکھ لو

خدا پرستوں نے کافر سمجھ کے مار دیا
پتہ نہیں کہ فرشتوں کو کیا لگوں گا میں

لاکھوں طرح کی زندگی آباد ہے یہاں
ہر مسئلہ ضروری نہیں آدمی کا ہو

شرکت ضروری ہوتی ہے تکمیل کے لیے
میں بھی کسی کا ہو گیا، تُو بھی کسی کا ہو

میں نے چپ رہ کے بتایا اس کو
بول پڑتا تو شکایت ہوتی

وہ کیا ہے جو مجھے تیرے قریب رکھتی ہے
درخت کون سی زنجیر سے بندھا ہوا ہے

خدا ضرور کرے گا مری طرف داری
مصور اپنی تصاویر سے بندھا ہوا ہے

سخن وری تو گھٹاتی ہے صرف دل کا غبار
سکون شعر کی تشہیر سے بندھا ہوا ہے

بحور حضرتِ غالب سے لے کے آئے ہیں
خیال میر تقی میر سے بندھا ہوا ہے

ہمیں نہ نیند کی قلت نہ خواب کی حمزہ
ہمارا مسئلہ تعبیر سے بندھا ہوا ہے

مسافروں کے لیے اور کوئی چھاؤں نہیں
درخت کٹ گیا، دیوار کے مزے لگے ہیں

کہیں سے پھول، کہیں سے دعائیں آ رہی ہیں
مرض کے نام پہ بیمار کے مزے لگے ہیں

کسی سے جنگ کسی سے جہاد چاہتے ہیں
خدا کے نام پہ کیا کیا فساد چاہتے ہیں

کریں گے تجھ سے کبھی خواب کے تبادلے بھی
ابھی تو صرف ترا اعتماد چاہتے ہیں

خدا کو خوشیوں کے عالم میں پوچھتے بھی نہیں
یہاں چراغ کو سب دن کے بعد چاہتے ہیں

میں بے سبب تجھے ملنے کا تھوڑی کہتا ہوں
نمو کے واسطے پودے بھی کھاد چاہتے ہیں

زمیں کے قبلہ نماؤں کو پچھلی مرتبہ آزما لیا تھا
اسی لیے اس سفر میں قطبی ستارے سے مشورہ لیا تھا

ہماری دنیا میں جتنی چیزیں تھیں سب کی ہیئت بدل گئی تھی
خزاں کی رت میں کسی نے شاید بہار کا گیت گا لیا تھا

میں جانتا ہوں کہ اس کے ہونٹوں پہ کیا ہے اور اس کے دل میں کیا ہے
کہ میں نے اصلی متون پڑھنے کے بعد ہی ترجمہ لیا تھا

میں ہنستے ہنستے تمہاری آنکھوں کے سامنے خودکشی کروں گا
تمھیں پتہ تو چلے کہ میں نے سکون کا بھید پا لیا تھا

باہر کی روشنی سے کہاں خاک ہو گئے
اپنی تپش سے کون و مکاں خاک ہو گئے

جذبات اور ریاضی میں کچھ مشترک نہ تھا
اچھا ہوا کہ سود و زیاں خاک ہو گئے

باغِ ارم کے بھیس میں آتش کدہ تھا دل
جتنے بھی لوگ آئے یہاں، خاک ہو گئے

خوں ٹپکتا ہے، خراشوں سے بھرا سینہ ہے
جو مجھے دیکھ کے خاموش ہے، نابینا ہے

مجھے ملنے سے سبھی اسی لیے کتراتے ہیں
جانتے ہیں کہ مرے ہاتھ میں آئینہ ہے

ملنے سے پہلے کوئی وسیلہ تلاش کر
پانی پہ چل کے کون ندی پار کرتا ہے

ٹھہراؤ دل کی طرح کسی ہاتھ میں نہیں
وہ وار بھی کرے تو لگاتار کرتا ہے

تپش ہے، دھوپ ہے، گرد و غبار ہے لیکن
یہ کیسا شہر ہے جس میں کوئی شجر نہیں ہے

برے کی خیر ہے، بدنام کے قریب نہ جا
گنہ کا خوف گنہگار سے زیادہ ہے

پرانی شکل سے بہتر ہے کچھ نیا پڑھ لیں
خطوں کی تازگی دیدار سے زیادہ ہے

جدید آدمی کب تک پرانے قصے سنے
فریب چھوڑ بھی دے بے وفا، کچھ اور سہی

معانی لفظ کے محتاج تھوڑی ہوتے ہیں
ترے لغت میں مرا ترجمہ کچھ اور سہی

ہزاروں چیزوں سے ہوتی ہے روشنی حمزہ
چراغ بجھ بھی گیا ہے تو کیا؟ کچھ اور سہی

زمین! تجھ سے یہ شرمندہ ہو کے کہہ رہے ہیں
ہم اگلی بار ستاروں پہ گھر بسائیں گے

جو خدا صبر کی تلقین کیا کرتا ہے
ہم اسے حال سناتے ہوئے رو پڑتے ہیں

تجربہ ہو چکا انساں سے نمٹنے کا مجھے
اب تو دل میں کوئی حیوان بھی آ جائے اگر

تیری یادیں بھی ترے ساتھ مرے دل میں رکیں
ایک ہی ڈبے میں سامان بھی آ جائے اگر

تو کسی اور طرف سے مجھے گاؤں لے چل
میرا دل کہتا ہے، یہ راستہ اچھا نہیں ہے

لاکھوں طرح کے معنی تھے خالی سلیٹ کے
ہر شے سے دلفریب نظارا خلا کا تھا

دنیا کے سب چراغ لگے تھے قطار میں
رستہ دکھانے والا ستارہ خلا کا تھا

حمزہ جگہ کے سارے مباحث فضول ہیں
جھگڑا ہی جب ہمارا تمھارا خلا کا تھا

☆☆☆☆☆

موجودہ ادبی صورتحال اور مدرسین کا کردار (مباحثہ)

حلقہ ارباب ذوق لاہور کا خصوصی اجلاس تھا، جس میں مباحثہ کا انعقاد کیا گیا اور مباحثے کا عنوان تھا - ''موجودہ ادبی صورتحال اور مدرسین کا کردار-'' اجلاس کی صدارت ممتاز شاعر و ادیب جناب ڈاکٹر ایوب ندیم نے کی- مہمان خصوصی معروف مزاح نگار ادیب، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک تھے-نظامت کے فرائض اعجاز رضوی نے انجام دیئے- صاحب صدارت سے گزشتہ اجلاس کی کارروائی کی توثیق کے بعد سب سے پہلے اعجاز رضوی نے بات کرتے ہوئے کہا کہ حلقہ ارباب ذوق نے جو مباحثوں کا سلسلہ شروع کیا ہے وہ انتہائی منفرد ہے- حلقہ کا مقصد صرف اور صرف ادب کی ترویج و ترقی ہے اسی لیے آج کا مباحثہ ''موجودہ ادبی صورتحال اور مدرس کا کردار رکھا گیا ہے تا کہ اس سلگتے ہوئے موضوع پر صاحبان ادب اور مدرسین صاحبان کی آرا لی جاسکیں- یہاں یہ بات بھی واضح کی جاتی ہے کہ مدرسین سے مراد مدرسوں اور مکتبوں میں تعلیم دینے والے مولوی یا خواتین وحضرات ہی مراد نہیں بلکہ اس دائرے میں کالج یونیورسٹی اور نجی تعلیمی اکیڈمیوں کے وہ اساتذہ بھی شامل ہیں جو ادب سے شغل رکھتے ہیں مگر اس سے زیادہ وہ اپنی حیثیت اپنی انا اور اپنے ظاہری وقار کے تابع ہوتے ہیں اس قسم کے مدرس، لیکچرر اور پروفیسر قسم کے لوگ ادب کی کیا خدمت کر رہے ہیں اور موجودہ ادبی ماحول کو کس طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں ان کا مقصد کیا ہے ہمارے اس مباحثے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے یہ ایک الگ بات ہے مگر آج یہ بات ضرور طے ہو جائے گی کہ ہمارے مدرس اور لیکچرار حضرات موجودہ حالات میں موجودہ طالب علموں کو کس طرح ادبی شخصیات اور ادبی تخلیقات سے متعارف کروا رہے ہیں ان کا انداز کیا ہے کیا وہ ادبی تخلیقی یا ادبی شخصیت کو اپنے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے پرکھتے ہیں یا

فیصل زمان چشتی

طالب علموں کو ادبی شخصیت اور ادبی تخلیق کی تشریح تعصب زدہ زبان و بیان سے کرتے ہیں درگزر کا رویہ رکھتے ہیں یا واقعی ادبی تخلیقی اور شخصیت کو بجھانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ مدرس یا پڑھانے والوں کی بھی اقسام ہیں ایک وہ جو عقل کل کے دعویدار ہیں اور دوسرے جو مستعار لیے ہوئے عقلی شعور کے پیروکار ہیں ایک نئی تنقید کا قائل ہے تو دوسرا تحقیقی نوٹس کا شیدائی۔ کسی کا نام عمران ہے تو اس نے دانش کا سہارا لے کر اسے عمرانی بنا دیا ہے کسی کا نام جمال ہے تو اس نے جمالیاتی تنقید متعارف کروا دی ہے کسی نے کسی کو ماموں بنایا تو اس نے مابعد الماموایات شروع کر دی۔ آیئے اس بات پر غور کریں اور ابدی صورتحال کو بہتر بنائیں۔

اس کے بعد اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب فرحت عباس شاہ نے کہا کہ علم کی تعریف تو محض جاننا ہے اور نہ ہی فقط معلومات کو جمع کر کے اس کے تجزیے سے حاصل ہونے والے یا اخذ کیے گئے نتائج ہیں میرے نزدیک کسی راز کے منکشف ہو کر مکمل شعور کے ساتھ انسان کی شخصیت اور کردار سے جھلکنے کا نام علم ہے اگر علم کی تعریف کی روشنی میں تعلیم کی تعبیر کی جائے تو تربیت کے لیے تعلیم و تربیت کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ کردار سازی خود اس کے جزو کے طور پر نظر آتی ہے۔ کتب کورسز، تعلیمی ادارے، اساتذہ، امتحانات اور پاس، فیل یا اول، دوم اور سوم کا معیار اس پیمانے اور ترسیل علم کے دیگر ذرائع مل کے ایک ایسا نظام ترتیب دیتے ہیں جس میں کلیدی کردار استاد، معلم یا مدرس کا ہوتا ہے۔ تعلیمی کورسز محض ڈیزائن اور تعلیم کا منافع بخش انڈسٹری کے طور پر رائج کیا جانا اگر زیر بحث لایا جانا نہایت اہم ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے عہدِ حاضر میں استاد کا کردار۔ خصوصاً ادب بلکہ اردو ادب کے مدرسین کے کردار اور اس کے نتائج کے حوالے سے خیالات کے اظہار مشاہدے، تجربے اور معلومات کی شیئرنگ تک محدود رہنا مجبوری ہے۔ ادب کو علوم کی ماں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ زندگی کے ہر ڈسپلن کو سمجھنے اور اس کے انسان پر عمل اور ردعمل کے تخلیقی اظہار اور پھر اظہار کی تفہیم تعبیر اور تشریح کو اس خلوص سے اپنے دائرہ فکر و نظر میں لاتا ہے کہ انسان کے بحیثیت انسان خالص انسانی پن کی نہ صرف تشفی ہوتی ہے بلکہ اسے محسوس کرنے کا موقع میسر آئے پوری دنیا کی طرح پاکستان پر بھی سرمایہ دارانہ نظام نے ہر اس شعبے کو شکنجے میں کس کے رکھ دیا ہے جس کا تعلق انسانی فکر اور احساس کی آزادی سے ہے۔ موسیقی، مصوری اور شاعری سمیت دیگر فنون

کی کمرشلائزیشن اور زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے کے مائنڈ سیٹ نے جس طرح باقی دیگر شعبوں کو آلودہ کیا ہے بلکہ ایسے ہی ادب کے معلمین کو بھی لپیٹ میں لیا ہے جو کہ یقیناً کسی المیے سے کم نہیں۔ جہاں تعلیم کے حصول پر ڈگریوں کے حصول کا رویہ آیا وہیں تعلیم دینے والے اساتذہ کی جگہ کورس ورک کروانے، ڈگریاں بلیک کرنے والے اساتذہ کی چاندی ہوگئی اور ہر ادارے میں حقیقی معنوں میں استاد کی جگہ پست ذہن، غیر تخلیقی اور بدنیت افراد استاد کے بھیس میں مسلط نظر آئے۔ میری اس تمام گزارش کی دلیل کے طور پر اگر آپ صرف ان اداروں کے شعبہ ہائے اردو زبان و ادب کی زیرنگرانی کروائے جانے والے تھیسس پر ہی تھوڑی سی تحقیق کر لیں گے تو ان کا معیار قابلیت اور فرض کی ادائیگی آپ کے سامنے آجائے گی۔

اگرچہ استادوں کی سیٹوں پر تعینات کیے جانے والے کتر اہلیت کے افراد کی تعداد سو فیصد نہیں لیکن جو اِکا دُکا شریف النفس لائق اور مدرس مزاج لوگ ان میں جا پھنستے ہیں یہ چالاک لوگ آپس میں گٹھ جوڑ کر کے نہ صرف انھیں ٹکرے لگائے رکھتے ہیں بلکہ آئے دن چھوٹے سے چھوٹے انتظامی یا تدریسی معاملات میں نہ صرف ان کے خلاف سازشیں بُنتے رہتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کی زندگی اجیرن کیے رکھتے ہیں یہی سلوک ان کے شاگردوں کے ساتھ بھی جاری ہے استاد کے ساتھ بنا کے رکھنے کا جبر تعلیم پر توجہ مرکوز رکھنے اور محنت کرنے کے حصول پر فوقیت دینے کا رویہ شاگردوں کی ذہنی بالیدگی اور شعور کے ارتقا کے رستے میں کس قدر رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے کسی بھی باشعور انسان کے لیے اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے اور طالبات کے ساتھ جنسی ہراسگی کے مسائل تو وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔

ادب میں نئے ٹرینڈز کے خلاف ہرزہ سرائی اور دو چار آؤٹ ڈیٹڈ شعرا کی آڑ میں درجنوں قد آور شعرا کے خلاف شاگردوں کے کچے اذہان کو زہر آلود کرنے کا وطیرہ ان پر ختم ہے۔ ادب اور ادیب کو ذاتی اور کمینگی پر مبنی تعصبات کی عینک سے نہ صرف خود دیکھنا بلکہ اس کو فروغ دینا تو جیسے ان کی فطرت ثانیہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ غالب، میر، اقبال، منٹو اور پطرس بخاری پر رٹے رٹائے لیکچر دے دے کر یہ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے خود کو ان اکابرین کے مرتبے سے بھی بلند سمجھنے کے ساتھ ساتھ سٹوڈنٹس کے ذہنوں میں بھی یہی ڈالتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بیٹھے یہ ناسور لاکھوں میں تنخواہیں بٹورتے اور ٹکے کا ڈلیور نہیں کرتے۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں یہ

حالات تجارتی تعلیمی اڈوں سے کہیں زیادہ مخدوش ہیں۔ اپنی بیویوں، دوستوں اور مخیّر لوگوں کو عظیم بنا کر پیش کرنے کا جرم بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ شاگردوں سے سخن شناسی ادب فہمی اور تجزیاتی فکر تک چھینی جا رہی ہے یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل سٹوڈنٹس ادیب نقاد شاعر محقق یا معاشرے کے مثبت افراد بننے کے بجائے متعصب اور علم دشمن بن کر نکلتے ہیں وہ اساتذہ جو معاشرے کے تہذیبی ارتقا میں براہ راست حصہ ڈالتے تھے ان کی جگہ سوڈا فیکٹریوں کے کلرک اور سیمنٹ ایجنسیوں کے نائم کیپر جگہ لے چکے ہیں۔ اگرچہ محنت کش ہر شعبہ میں قابل احترام ہیں لیکن ہمارے جیسے معاشروں میں پہلی نوکری اور پہلے تعلیمی ادارے کے باعث راسخ ہو جانے والی ذہنیت مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔

میرے اس مقالے کے لیے کیے گئے سروے کے میدان ایک یونیورسٹی کے وی سی نے بتایا کہ مجھے انتظامی اور اخلاقی سطح کے مسائل کا سامنا سب سے زیادہ شعبہ اردو کی طرف سے کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ شعبہ اردو کے نگران ایڈمنسٹریٹر میٹنگز میں بھی کم کم ہی تشریف لاتے ہیں۔ ایک کالج کے پرنسپل نے بتایا کہ شعبہ اردو کے ٹیچرز کے کالج میں کسی شاعر یا ادیب کو مدعو کرنے میں اپنی پسند اور ناپسند سے باہر نکل کر سوچنے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ ایک یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ہیڈ نے بتایا کہ بہت سارے علمی معاملات میں میرے ہاتھ باندھ دیے جاتے ہیں اور علمی ترجیحات پر سیاست مسلط کر دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے قلمی دشمنی کے نام سے روزنامہ 92 نیوز میں شائع ہونے والے ضمنی عنوان ''تحقیق کو تخلیق کی بددعا لگی ہے'' کے تحت دو قسطوں میں شائع ہونے والے کالموں میں تعلیمی اداروں کے ہاتھوں غیر معیاری تحقیق کے ہتھیار سے تخلیق کے قتال کی روداد کسی المیے سے کم نہیں۔ یہ صرف چار مثالیں اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ میرے اس مقالے پر کسی ذاتی عناد کا شیکر چپکا کر یہ غیر استاد مکار طبقہ اس کی صحت سے انکار کر کے اپنے آپ کو صاف بچا نہ لے جائے کیونکہ ان کی تمام تر مہارت تعلیم و تدریس کے بجائے اسی کام میں ہی تو ہے۔

ایسا ہرگز نہیں کہ عظیم، دانا اور نیک خصلت اساتذہ موجود نہیں۔ موجود ہیں لیکن جرائم پیشہ افراد کا نیٹ ورک اتنا مضبوط ہے کہ انھیں جہاں بھی کہیں دانائی اور معصومیت کا حامل نظر آتا ہے یہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح جتھا بنا کر ان کا جینا حرام کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے اور میرے جیسے اردو ادب کے طالب علموں کو کونسی پوزیشن لینی ہوگی کیا ہمیں علم دوست

اور خالص دانا اساتذہ کا ساتھ دینا ہے یا مفاد پرست نام نہاد اور نالائق استاد لوگوں کی طرف کھڑا ہونا ہے۔

اگر کوئی ادارہ یا فرد میری ان گزارشات کی ویلیڈیٹی دیکھنا چاہے تو ٹارگٹ پاپولیشن کے سیمپل کے طور پر صرف پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے شعبہ اردو کا سوشل اور تدریسی آڈٹ کروالیا جائے سارا کچا چٹھہ باہر آجائے گا۔

فرحت عباس شاہ کے بعد پروفیسر شفیق احمد خان نے بات کرتے ہوئے کہا کہ میرا ذاتی تجربہ بھی مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جانے سے یہی رہا کہ ایک خاص طرح کی حالت میں یہ لوگ کام کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال اچانک وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ ایک تاریخی تسلسل ہے جس کا نتیجہ آج کی صورت حال کی شکل میں سامنے ہے، لگتا ہے تعلیمی اداروں میں جو تنقید لکھی گئی یا جو ادب کی ترویج ہوئی اس کی دو سطحیں بنتی ہیں ایک وہ لوگ جو تخلیقی سطح پر مضبوط تھے دوسرے وہ جنھوں نے صرف ڈگری حاصل کر کے چالاکی سے پی ایچ ڈی کر کے نوکری حاصل کر لی لیکن ان کی علمی سطح وہ نہیں تھی جس کا یہ شعبہ متقاضی ہے اور نوکری حاصل کر کے اپنے آپ کو ادیب بھی ظاہر کیا اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو بہتر کام کرنے والے تھے انھوں نے اچھی تخلیق کی اور اچھی تنقید بھی کی۔

بنیادی طور پر یہ ذہین لوگ تھے مثال کے طور پر ڈاکٹر سہیل احمد خان، ان کی علمی سطح سے کم لوگ انکار کریں گے دوسرے طبقے نے دائرے بنائے اور لوگ فکس کیے۔ دو تین شاعر اور ادیب لے کر کام شروع کیا مثال کے طور پر مجید امجد اور راشد ہے۔ راشد کا جب صد سالہ جشن منایا جا رہا تھا تو اس پر چھ کتابیں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں چھپیں اور غالباً 4 کتابیں پنجاب یونیورسٹی سے چھاپی گئیں۔ دو روزہ سیمینار تھا، جس میں بڑے بڑے ڈاکٹر صاحبان آئے اور تقاریر ہوئیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر مضمون پڑھ رہے تھے اور اس میں انھوں نے پڑھا کہ راشد فلاں شہر میں آئے اور بارہ بج کر تیس منٹ پر تانگے سے اترے اس میں کونسی تحقیقی و علمی بات ہے وہاں اتنے وقت پر یہ کام کیا اتنے وقت پر یہ کام کیا۔ یہ سطح ہے تحقیق و تنقید کی۔ میرے خیال میں راشد پر ڈاکٹر آفتاب احمد کی جو کتاب تھی اس سے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکا اور باقی کتابیں اسی کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ مقصد ہے کہ ہم نے ایک بندہ پکڑا اور اسے رگیدنا شروع کیا اس سطح نے ہماری تنقید اور ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگریز دور میں بہت سی تحریکیں اور اصناف بھی اُدھر سے اِدھر منتقل ہوئیں جیسا کہ آزاد نظم، جدید نظم، شارٹ سٹوری یا ناول تھا بہت سی چیزیں یہاں کے

سماج اور تاریخ سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ اسی طرح تحریکیں جو یورپ سے انھیں جیسا کہ رومانوی تحریک۔

اُدھر کی تحریک ضروری نہیں کہ اِدھر بھی کامیاب ہو اور لوگوں کو متوجہ کر سکے۔ جب زبردستی ٹھونس دی گئیں تو مسائل پیدا ہوئے وہاں کی تنقیدی تھیوریاں بھی ایڈجسٹ نہ ہو سکیں اور طالب علموں کو جبر کی کیفیت میں لایا گیا اس سے سوائے ذہنی انتشار کے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ یہ ایسا کام ہے جو تعلیمی اداروں کے ذریعے ٹھونسا گیا۔ کچھ پروفیسر صاحبان کے ذہن فکس ہوتے ہیں اور وہ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں اور آگے پیچھے بالکل نہیں دیکھتے اور جو آدمی تخلیقی، تحقیقی یا مشاورت کی بات کرے اسی کو زیرِ عتاب لاتے ہیں۔ ان رویوں نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا اور تعلیم و کتاب کو بھی نقصان پہنچا۔ پرائیویٹ اداروں میں نئے لوگوں پر کام ہوا۔ اور انھوں پرانے تعلیمی اداروں کی جکڑ بندیوں کو توڑا۔ ایک بندے کی پرستش سے باہر نکلنا چاہیے۔ راشد ایک شاعر ہے جتنا اس پر کام کروایا جا چکا اتنی ضرورت بالکل نہیں تھی ایک حد تک ٹھیک تھے۔ جو آپ حد سے تجاوز کرتے ہیں تو صفت بھی نفی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پرانی یونیورسٹیاں اب بھی اسی ڈگر پر چل رہی ہیں جس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد بات کرتے ہوئے جناب علی نواز شاہ نے تیرھویں اور چودھویں صدی کے شاعروں کی شاعری کو جو اہمیت کی حاصل ہے خصوصی طور پر تصوف کے حوالے سے وہ پنجابی ادب کے حوالے سے بہت اہم وقت تھا۔ بابا بلھے شاہ اور داتا صاحب نے نثر کے حوالے سے بہت کام کیا۔ اس کے بعد غالب، میر، میر انیس اور پھر بعد میں علامہ اقبال آئے پھر نظریاتی شاعری فیض احمد فیض اور حبیب جالب انھوں نے بہت کام کیا۔ وہ فرانسیسی ادب سے متاثر تھے اس پس منظر سے جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس عہد کے بڑے شاعر متاثر ہوئے۔ ایران، جرمنی، فرانس کے ادب سے بعد کے عہد والے متاثر ہوئے۔ ان نظریات کو قبول کیا۔ اور اردو ادب کے شاعروں ان کے اثرات نظر آتے ہیں۔ انسانی حقوق مغرب میں ہم سے پہلے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نظریے دیئے، جس کے ثرات پوری دنیا میں پڑے۔ اردو کے شاعروں نے ان سے سیکھا اور متاثر ہوئے۔ ہمارے مشاعروں نے نظریات کی ترویج کی۔ شاعروں نے سیاست میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ حق سچ کی بات کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے وہ اساتذہ جن کا ادب میں حصہ تھا وہ حکومت کے ساتھ رابطے میں رہے اور عہدے حاصل کیے۔ ایک شاعر

سیاسی اور سماجی لیول پر لوگوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ بڑی شاعری چشمے کے پانی کی طرح پتھروں کو بھی ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ خالص اور سچی آوازیں کم ہوتی ہیں جو لوگوں کی آواز بنتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں استاد کا کردار نہایت اہم ہے لیکن وہ گروپ بندی اور اپنی اپنی دکانداری چمکانے میں مصروف رہے، جس سے ادب کو نقصان پہنچا۔ اساتذہ نے بڑے بڑے ادیب اور شعرا پیدا کیے جنھوں نے دنیا میں انقلابات برپا کیے۔ اگر اساتذہ اپنے منصب کا خیال رکھیں تو معاشرہ اور خوبصورت تصویر پیش کرے گا۔ اپنے مفادات کو بالائے طاق رکھا جائے تو معاشرے میں امن اور مساوات پیدا ہوگا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا موضوع میرا ذاتی مسئلہ بھی ہے۔ میری یونیورسٹیوں سے بھی لڑائی رہتی ہے اور بہت سی یونیورسٹیوں میں بورڈ آف سٹڈیز کا ممبر بھی ہوں۔ میں خود بھی استاد ہوں۔ اصل ادب تو تخلیق ہے ممتاز مفتی کہا کرتے تھے کہ ادب وہ ہے تخلیق۔ تخلیق ایک شہزادی ہے اور تنقید اس کی باندھی ہے ہم نے باندھی کو تخت پر بٹھا دیا اور شہزادی کو گھر سے نکال دیا۔ یہ مسئلہ ہے ہمارا۔ 88-1986 کا سیشن تھا اس میں تقریباً ستر لوگ تھے اور تین چار لوگ تخلیقی کام کرتے تھے جن میں ایوب ندیم، جمیل احمد عدیل اور میں تھا اگر کوئی ادبی حلقوں میں ہمارا نام لیتا ہے یا ہم سانس لے رہے ہیں تو ہماری تخلیق کی وجہ سے ہے باقی لوگوں کا پتہ نہیں ہے کہ وہ کہیں پڑھا رہے ہوں نوٹس لکھوا رہے ہوں گے۔ تخلیق میں اتنی طاقت ہے کہ بندہ تخلیق کار کو نمایاں مقام بھی دے سکے اور زندہ بھی رکھ سکے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ یونیورسٹیوں میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ اس سطح کے حامل نہیں ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی جیسی بڑی اور قدیم یونیورسٹی میں حالات دیکھ کر رونا آتا ہے۔ آج جو تحقیق کرائی جا رہی ہے اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ مثلاً موضوعات دیکھیے ''اردو ناولوں میں پرندوں کا تذکرہ، اردو افسانے میں موسموں کی بات، اردو شاعری میں تصور بیگانگی۔ کہاں گئی اصل شاعری اور ادب۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ جو شخص ایک اچھی کتاب پڑھ لیتا ہے وہ اپنے ہم عمروں سے ایک سال بڑا ہو جاتا ہے۔ کھی مارکہ اور بے ہنر تحقیق یا کٹ پیسٹ تحقیق نے تباہ کر دیا ہے۔ پچانوے فیصد تحقیق کٹ پیسٹ ہوں گی اور یہیں سے تعلیم کی تباہی ہے۔ یہ رویے، ہمیں تباہ کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ شاعر معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے۔ میری ایک عزیزہ نے ایک بہت بڑی یونیورسٹی سے پی

ایچ ڈی کیا تو میں نے پوچھا کہ کیسا ہے وہاں کا ماحول تو اس نے جواب دیا کہ وہاں اساتذہ نہیں مرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس ایک فقرے نے ساری صورت حال واضح کر دی۔ مشفق خواجہ نے ایک مضمون لکھا تھا کہ علامہ اقبال اور چیچو کی ملیاں گھما پھرا کر سو صفحات لکھ کر محقق نے یہ ثابت کیا تھا کہ علامہ اقبال کبھی چیچو کی ملیاں نہیں گئے تھے۔ یہ ہے ہماری تحقیق کا عالم۔ بدقسمتی سے یونیورسٹیوں میں جو اساتذہ بیٹھے ہوئے ہیں وہ تخلیق کار نہیں ہیں وہ جس طرح بے مغز تحقیق کرتے آئے تھے آگے بھی وہی کام جاری ہے۔ ایک تخلیق کار کو بھی اپنی تخلیقات کے نمبر ملنے چاہئیں۔ پطرس بخاری اپنے گیارہ مضامین کے ساتھ آئے۔ سبھی اردو ادب کا واحد مزاح نگار کہتے ہیں تو ان کی تنقید ایک طرف پڑی ہوئی ہے لیکن وہ گیارہ تخلیقی مضامین سب پر بھاری ہیں۔ بنا بنایا سلیبس ہے، نوٹس تقسیم کرتے ہیں رٹاتے ہیں اور امتحان میں طالب علموں کو بٹھا دیتے ہیں۔ ہماری اپروچ یہ ہونی چاہیے کہ علم و تحقیق کی بات اور کام ہونا چاہیے جبکہ آج نمبروں کی سکیم ہے۔ سمریاں، مضامین اور دوسری باتیں رٹ کر امتحان دے کر ہائی مارکس لینے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور ان طالب علموں کو نوٹس سے ہٹ کر ایک جملہ بولنا نہیں آتا۔ ٹیوشن والے اساتذہ نے بچوں کے ذہنوں میں بھی یہ ڈال دیا ہے کہ ادب کوئی چیز نہیں تخلیق کچھ نہیں اس لیے نمبروں پر توجہ دو۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ پوری دنیا میں لٹریچر پڑھے بغیر بی ایس سی کی ڈگری نہیں دی جاتی لیکن ہمارے ہاں ہر چیز کے اپنے قوانین ہیں۔ تاریخ اور ادب سارے علوم کی ماں ہے اور ہم نے اس سے اپنے بچوں کو دور کر دیا ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم اپنی زبان کو بھی بھولتے جا رہے ہیں اور بچوں کو اردو لکھنی اور پڑھنی انتہائی مشکل لگتی ہے۔ بچے اپنا نام اردو میں نہیں لکھ سکتے یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ آج کا مدرس ادب سے بہت دور ہے۔ نمبر لینے کی چوہا دوڑ لگی ہوئی ہے۔ سکول اور کالجوں کے اساتذہ نمبر دلوانے کے لیے ہیں۔ ادب تاریخ کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ سیاست اور کرسیوں کی ایک دوڑ ہے جو اساتذہ میں لگی ہوئی ہے۔ آپ حساب لگائیں کہ بی۔ ایس کی مجوزہ کتب ایک سو چالیس ہیں۔ میں نے بورڈ آف سٹڈیز کو کہا کہ مجھے کوئی استاد دکھائیں جس نے یہ تمام کتابیں پڑھی ہوں۔ انٹر کے بچے کو آپ ڈرا رہے ہیں یہ ہمارے معاشرے کی بدقسمتی ہے۔ سو سو صفحات کا تھیسز لکھوانے کے بجائے اس کو اصل کتابوں پر ایک ایک صفحے کا ذاتی تبصرہ لکھوایا جائے تو یہ زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ اس سے یہ

سارا کلچر تبدیل ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد محترمہ شہناز نقوی صاحب نے کہا کہ آج بہت موضوع پر مباحثہ ہے اور میں حلقہ ارباب ذوق کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں کہ اس قسم کی بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ کالج اور یونیورسٹیوں کا ماحول بہت خراب ہے۔ گروپ بندی ہے۔ سیاست ہے اور جس طرح پہلے کہا گیا کہ جنسی ہراسگی کے کیسز اخبارات میں ہم روزانہ کی بنیادوں پر پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ضابطہ اخلاق وضع کیا جائے اور سب کو اس کا پابند کیا جائے۔ تحقیق و تنقید کی حوصلہ افزائی کی جائے اور کاپی پیسٹ تھیسیز کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ سینئر اساتذہ کرام کو اور بڑے شاعروں اور ادیبوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ ہمارا معاشرہ بھی علم و ادب کے میدان میں آگے جا سکے۔

اس کے بعد محمد احمد نے بات کرتے ہوئے کہا کہ آج کا موضوع نہایت اہم ہے میرے جیسے کئی طالب علم ان مسائل کا شکار ہوتے رہیں اور میں خود اسی کا شکار رہا ہوں۔ پہلے میرا ایم فل لیٹ کیا گیا پھر جان بوجھ کر نمبر کم لگائے گئے تاکہ پی ایچ ڈی کا میرٹ نہ بن سکے۔ طالب علموں کا پتہ نہیں ہوتا اور ان سے ہاتھ ہو جاتا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے ہاں ایسی تعلیمی پالیسیاں بنیں جس میں ایسی بے انصافیاں نہ ہوں لوگوں کے حقوق اور قابلیت کا خیال رکھا جائے اور زیادتیوں کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ علم و ادب اور تحقیق کے میدان میں ہمیں بھی ترقی کرنی چاہیے۔ میں صرف اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے آیا ہوں تاکہ میرے جیسے طالب علموں کا علمی و ادبی اور معاشی نقصان نہ ہو۔

آخر میں صاحب صدارت ڈاکٹر ایوب ندیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے میں فرحت عباس شاہ کو "تمغہ حسن کارکردگی" حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچے تخلیق کار کو یہ اعزاز ملا ہے جو ماضی میں پرچوں پر دیا جاتا تھا۔ جب ایک صحافی ادیب کو تمغہ حسن کارکردگی ملا تو منیر نیازی، قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی نے کتنا احتجاج کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق کا درجہ تنقید سے بلند ہے، مگر تنقید بھی کم نہیں ہے۔ شیلے نے جب شاعری شروع کی تو اس کے دوستوں نے کہا کہ چھوڑو شاعری وغیرہ۔ زیادہ سے زیادہ ایک کتاب لکھ لو گے وہ پھر کسی لائبریری میں جائے گی اور کسی کونے کھدرے میں پڑی رہے گی۔ مٹی کے انبار اس پر لگ جائیں گے تو تم شاعری میں کیا وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ میں کتاب لکھوں گا۔ وہ کسی لائبریری کی شیلف میں چلی جائے گی اس پر مٹی کی تہہ جم جائے گی اور آلودہ ہو

جائے گی وہ بند پڑی رہے گی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک دن ایک محقق آئے گا۔ وہ میری کتاب اٹھائے گا اس کی مٹی جھاڑے گا اس کو پڑھے گا اور اس میں سے مجھے دریافت کرے گا۔ تحقیق وتنقید بے معنی چیزیں نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اردو ادب کے عروج وزوال میں اساتذہ نے کردار ادا کرنا تھا اور ادا کیا۔ ہماری کالج لائف میں بین الکلیاتی مشاعرے اور مباحثے ہوتے تھے وہ اب نہیں رہے۔ اگر کوئی پرنسپل کسی کالج میں تعینات ہو جائے تو انتظامی پوسٹ پر دو تین سال بعد تبدیل ہونا چاہیے مگر وہ تاحیات اس پر قابض ہو جاتا ہے سارا دن گپیں لگاتا ہے کوئی کام نہیں ہوتا اور اپنی ریٹائرمنٹ کا انتظار کرتا ہے۔ یہ سارا نظام کس نے تباہ کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہم پر حاکم ہیں۔ اگر آپ منا پلی لے آئیں گے تو کئی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ تبدیلی سے مواقع پیدا ہوتے ہیں اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ ایک مقصد ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ہم چند مدرسین کو بُرا بھلا کہہ کر دل تو ٹھنڈا کر سکتے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر جگہ پر جھاڑو پھیرا جائے اور اسباب دور کیے جائیں۔ جب ہم سارا سلیبس بناتے ہیں وہاں ہم خاموش کیوں ہوتے ہیں۔ ہم نے نوٹس کلچر کے ذریعے سٹوڈنٹس سے کتاب کا رشتہ توڑ دیا ہے۔ ہم کتاب کو پڑھنے سے روکتے ہیں اور جو کوئی پڑھنا چاہے اس پر تنقید بھی کرتے تھے۔ جب بچہ کتاب نہیں پڑھے گا تو وہ اچھا محقق کیسے بن سکتا یہ ساری چیزیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں اگر محقق اور نقاد نہیں رہے گا تو تخلیق کا معیار کون مقرر کرے گا۔ ہم سب چیزوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اپنے انچارج کے بغیر کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی شعری مقابلہ یا کوئی اور ادبی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ زیادہ تر تعلیمی اداروں کے سربراہ ادبی پس منظر نہیں رکھتے۔ کوئی فزکس کا ہے کوئی کیمسٹری کا ہے کوئی میتھ کا ہے ان کو ادب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ سارا کلچر بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اوپر سے کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ تبدیلی اوپر سے آئے گی تب ہی یہ ممکن ہے۔ یہاں پر ایسے ایسے پروفیسر بھی موجود ہیں جنھوں نے کبھی لیکچر ہی نہیں دیے وہ کیا علم آگے منتقل کریں گے۔ ہمیں انفرادی اور اجتماعی سوچ میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے تاکہ علمی وادبی اور تحقیقی و تنقیدی ماحول کو بہتر بنایا جا سکے۔

صاحب صدارت کے خطاب اور کلام کے بعد اجلاس کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

غزل

چڑیاں اڑ اڑ کر رہ جائیں
بابل کا گھر بھول نہ پائیں

بہنیں ہی نندیں بننے کو
گاجوں باجوں کے ساتھ آئیں

مائیں ہی ساسیں ٹھہریں گی
بھولی چڑیاں جان نہ پائیں

لاج کے مارے تھَر تھَر کانپیں
بندی کاجل کرتی جائیں

راتوں جاگ کے رستہ دیکھیں
باگ وہ موڑیں گھر وہ آئیں

جوگی کِس کے میت ہوئے ہیں
یہ تو کنویں جھانکیں جھنکوائیں

خالد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

غزل

اُسی کو جانتا پہچانتا ہے
مرا دل غم کو مرشد مانتا ہے

بہت سے عکس ہیں میرے جنوں کے
مجھے ہر آئینہ پہچانتا ہے

سگِ دنیا کھڑا ہے تیرے در پر
اِسے تو بے ادب گردانتا ہے

اُسے دریا سے ناکامی ہوئی تھی
وہ پاگل ریگِ ساحل چھانتا ہے

میں تنکا ہوں بہے جاؤں گا ثاقبؔ
مجھے سارا سمندر جانتا ہے

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موجِ خوں بن کر دلِ حساس سے اچھلیں گے کب؟
ہم درِ اظہار سے کس دن گزارے جائیں گے

غزل

یوں نہ یکدم مِل
رُک سکتا ہے دِل

جادو کرتی آنکھ
باتیں کرتا تِل

کل کا ماضی ہے
اب کا مستقبل

جانا ہے تو جا
ملنا ہے تو مِل

سچا ہے تو بول
غنچہ ہے تو کِھل

چہرے پھولوں سے
پتھر جیسے دل

(ق)

روز نیا آزار
روز نئی مشکل

منصف، جانب دار
مفتی ہیں جاہل

لوگ نہیں کمزور
حاکم ہیں بزدل

بکھر گئے سب یار
اُجڑ گئی محفل

کون گواہی دے!
ٹکڑے ہیں قاتل

بے چہرہ سے خواب
عمروں کا حاصل

اس بربادی میں
کون نہیں شامل!

ہمت ہم سفرو
دور نہیں ساحل

سورج سر پر ہے
اُٹھ جا او کاہل

غالب سے پوچھو
رُتبۂ بیدل

رستہ، رستہ ہے
منزل ہے منزل

امجد اسلام امجد

غزل

کس کس جتن بیاں سے گزارا نہیں گیا
لفظوں میں اپنا درد اتارا نہیں گیا

آیا سمے کے بند بہاؤ میں جب سے دل
موجِ دِگر کے ساتھ دوبارا نہیں گیا

جس کے کہے پہ سازشیں ساری بُنی گئیں
اُس کی طرف ذرا بھی اشارہ نہیں گیا

سچ کے محاذ پر رہا خاموش جو قلم
اُس کو کسی حساب شمارا نہیں گیا

سب کہکشائیں دُھول ہوئیں دُکھ کی دھوپ میں
دل کے افق سے خواب ستارہ نہیں گیا

ذوقِ جمال سوچ دھماکوں کی زد پہ تھا
مجروح تو بہت ہوا مارا نہیں گیا

کیا کیا یقین کب سے سپردِ شکست ہیں
اک گوہرِ گماں ہے جو ہارا نہیں گیا

اک ضربِ وقت اُس پہ رہی کیسی کارگر
جو عیبِ ہست ہم سے سنوارا نہیں گیا

عالی اُسے رفیقِ سفر کس طرح کریں
جس سے ذرا سا سہم سہارا نہیں گیا

جلیل عالی

غزل

فرق بزمِ طرب و مجلسِ ماتم میں کہاں
رند کو ہوش ہی میخانۂ عالم میں کہاں

عشق ہر حال میں راضی بہ رضا رکھتا ہے
ہم بدلتے ہیں مسرّت میں کہاں، غم میں کہاں

سخت جانی ہمیں مرنے نہیں دیتی ورنہ
ہم جنھیں دیکھ کے جیتے تھے وہ اب ہم میں کہاں

زندگی! ہم نے سنوارا ہے سلیقے سے تجھے
اب کوئی پیچ ترے گیسوئے پُرخم میں کہاں

دل ہی سنتا ہے تحمّل سے ہماری باتیں
اس قدر ظرف کسی دوسرے محرم میں کہاں

وہ تو سر تا بہ قدم ایک فرشتے ہیں شعور
شیخ جی ہو گئے پیدا بنی آدم میں کہاں

انور شعور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ خواب خواب سا تن جاگ سا گیا آخر
اسیرِ دَر بھی دریچوں تک آ گیا آخر

غزل

مانا کہ تازہ حرف کا اظہار اور ہے
دل میں جو گھر کرے گا وہ معیار اور ہے

پہلے فراغتوں کے زمانے تھے ہمقدم
اب دیکھیے تو وقت کی رفتار اور ہے

ہیں دائرے میں درد کے مارے یہاں وہاں
اور بوالہوس کا نقطۂ پرکار اور ہے

چہرے پہ سب کے آنکھ ہے سب دیکھتے بھی ہیں
سچ ہے مگر یہ دیدۂ بیدار اور ہے

محرومیوں کا اس کو نہ الزام دے سکا
اس کی خطا نہیں ہے خطاکار اور ہے

اچھا رہا یہ کھیل کہ مقروض میں ہوا
دولت میں کھیلتا ہے جو مے خوار اور ہے

آرام کی طلب ہے تو چل سر کے بل حسن
اس کی گلی کا سایۂ دیوار اور ہے

حسن عسکری کاظمی

غزل

جس قدر آسمان باقی ہے
زیست کا سائبان باقی ہے

کر چکا ہوں ہزار پروازیں
سب سے اونچی اڑان باقی ہے

کوہکن کب کا ہو چکا رخصت
اک شکستہ چٹان باقی ہے

دل سرائے ہے اور تیری یاد
اک یہی میہمان باقی ہے

ماجرا دل کا کُھل کے کہہ لیجے
ابھی اردو زبان باقی ہے

اک مسیحا کے یاد رکھنے کو
زخمِ دل کا نشان باقی ہے

مٹ گئے اہلِ تخت و تاج سحر
ہم غریبوں کی شان باقی ہے

سحر انصاری

غزل

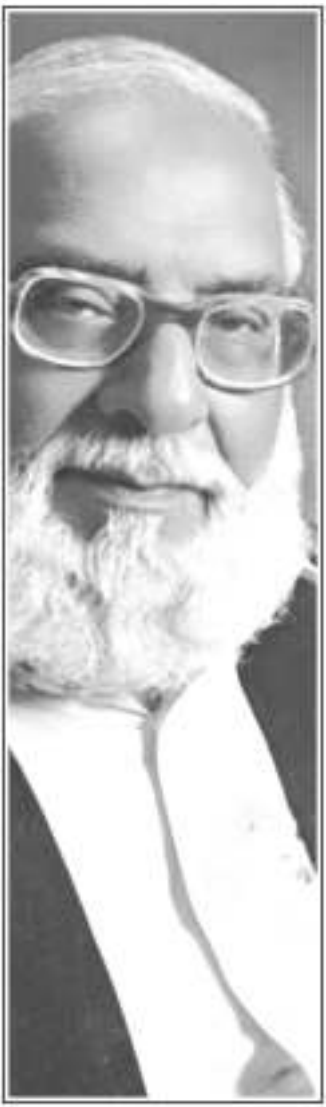

ہے یہ لازم کہ ہوں دوائیں بھی
کام آئیں مگر دعائیں بھی

ہوتا رہتا ہے سانحہ نت روز
اجڑی رہتی ہیں اب فضائیں بھی

راہی آنکھیں نہ بند کر بیٹھیں
راستے میں ہیں کچھ بلائیں بھی

ہم سا دریوزہ گر کہاں ہو گا
کون چاہے گا یوں عطائیں بھی

بے طرح کیوں کسی کو ہونے دیں
طرح داری اسے سکھائیں بھی

مہک اٹھے گی وادی دل میں
نخل خوشبو اگر لگائیں بھی

آنکھ والے بھی حق کو پہچانیں
کور چشموں کو وہ جگائیں بھی

بھیروں کا ریاض کر کے ریاض
من کے مندر سے لو لگائیں بھی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

جب بھی لکھتا ہوں سخن کاغذ پر
چمک اُٹھتی ہے کرن کاغذ پر!

اُس کے ماتھے پہ شکن کیا آئی
پڑ گئی ایک شکن کاغذ پر

حالِ دل لکھنے میں یہ خوف بھی ہے
منتقل ہو گی گھٹن کاغذ پر

ذِکر اُس غنچہ بدن کا جو چھڑا
کِھل گیا ایک چمن کاغذ پر

شعر کے حسن کو غارت کرنے
ہیں کئی زاغ و زغن کاغذ پر

میری تقدیر میں اے رازقِ فن
لِکھ مِرا رزقِ سخن کاغذ پر

شعر میں نام جب اُس کا آیا
چل پڑی جیسے پَوَن کاغذ پر

آگ لگ جائے نہ کاغذ کو کہیں!
یوں نہ لکھ دِل کی جلن کاغذ پر

میں نے اِک پھول بنایا تھا نسیم
بن گیا اُس کا بدن کاغذ پر

نسیمِ سحر

غزلیں

جن کو زمانہ عشق میں برباد کرتا ہے
رہتے نہیں تو روز اُنھیں یاد کرتا ہے

پھرتے ہیں اِک نگر کی تمنا میں کو بہ کو
دیکھیں کہاں وہ پھر ہمیں آباد کرتا ہے

یارب! اُسے بھی چاہیے نظرِ کرم کرے
انسان جس کے سامنے فریاد کرتا ہے

پڑتا ہے یونہی پہلا قدم دشتِ عشق میں
باقی کا کام حسنِ پری زاد کرتا ہے

آتے ہیں اِس جہاں میں سبھی طفلِ شیر خوار
کچھ کچھ کو وقت دہر کا اُستاد کرتا ہے

خاور اعجاز

ہم تو جگنو تھے سیہ رات کے دوران گرے
تم ستارہ تھے، کہاں جا کے مری جان گرے

عمر بھر چین سے ہم سو نہ سکے اِس ڈر سے
آئنہ خانے میں پتھر نہ کوئی آن گرے

خُود پسندوں نے سزا پائی ذرا دیر کے بعد
ہم تو بیخود تھے سو ہم رقص کے دوران گرے

مجھ پہ لازم ہے کہ مَیں خُود بھی صف آرا ہو جاؤں
اِس سے پہلے کہ مرے گھر کا نگہبان گرے

کوئی تبدیلی مگر ہو کے رہے بستی میں
اَب کے سلطان گرے یا کوئی دربان گرے

دیدنی تھی لبِ دریا مری تشنہ دہنی
آسماں والوں کے بھی اشک وہاں آن گرے

غزل

اب تعلّق کا کوئی اور حوالہ نہیں ہے
آج تک اُس نے مجھے دل سے نکالا نہیں ہے

اپنے کاندھوں پہ اُٹھایا ہے بُڑھاپا اپنا
ہم نے اولاد پہ یہ بوجھ بھی ڈالا نہیں ہے

کون سی ماں ہے، جسے پال رہی ہے اولاد؟
کون سا لال ہے، ماں نے جسے پالا نہیں ہے

تم نے پہلے کبھی دیکھا نہیں اندھا سورج
یہ اندھیرا ہے مِری جان! اجالا نہیں ہے

ہر سوالی ہمیں اچھی طرح پہچانتا ہے
یہی دروازہ ہے، جس پر کوئی تالا نہیں ہے

بھیک دیتے ہوئے چہرہ نہیں دیکھا کرتے
حکمرانوں کو بھی ہم نے کبھی ٹالا نہیں ہے

مافیاؤں کی سرِعام عمل داری میں
سُنتے ہیں، کوئی بھی قانون سے بالا نہیں ہے

وہ بھی روتا ہے مرے ہجر میں اے جانِ انیس!
کیسے کہہ دوں مرا غم اُس نے سنبھالا نہیں ہے

محمد انیس انصاری

غزل

ہوں قید اِس طرح میں خود اپنے حصار میں
اِک آئنہ ہو جس طرح دیوارِ غار میں

گھر کی چٹائی تختِ سلیماں ہے پوچھ لیں
اُن سے بسیں جو دُور کسی بھی دیار میں

پنچھی ہوں ایک میں بھی فضائے بسیط میں
جو تھک چکا ہے اُڑتے پرندوں کی ڈار میں

پہنے ہوئے ہوں یوں تو ستارے مَیں بے شمار
لیکن نہیں وہ چاند جو روشن تھا ہار میں

جو بات سوزِ دل میں اور آہِ تپاں میں ہے
وہ بات ہے کہاں بھلا برق و شرار میں

اہلِ وفا کا مَرنا ہے غماز جیت کا
اہلِ ہوس تو رہتے ہیں سرشار ہار میں

جس نے بھی عشق منزلِ مقصود سے کیا
کھویا نہیں وہ راہ کے گرد و غبار میں

الزام بے وفائی کا کیوں کر میں دوں اُسے
شاید کمی ہی رہ گئی ہو میرے پیار میں

اے آفریں وہ ساعتیں ممکن نہیں ملیں
جو کھو گئی ہیں گردشِ لیل و نہار میں

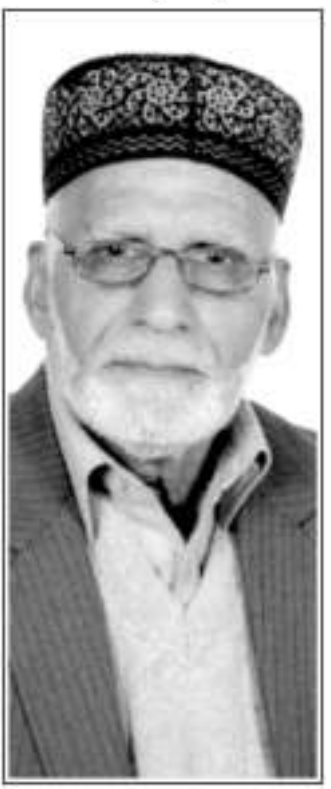

رشید آفرین

غزل

ہیں چور تو بہت سے مگر سب نہیں جناب
پہلے جو ہو چکا ہے یہاں اب نہیں جناب

مجبور مت کریں مجھے رد و بدل پہ آپ
سو بار میں نے کہہ تو دیا جب نہیں جناب

آتا ہے کون خشک کنویں کی منڈیر پر
ایسا نہیں کہ ملنے کا مطلب نہیں جناب

کس غم میں پڑ گیا ہوں انہیں دیکھنے کے بعد
دن لا پتا کہیں تو کہیں شب نہیں جناب

منہ سے نکل گئی تھی جو دورانِ گفتگو
اس بات کا کہیں سے وہ مطلب نہیں جناب

انگشت لبلبی پہ ہے بندوق وقت کی
ہاتھوں میں اس کے جامِ لبالب نہیں جناب

راحت ہو آدمی تو رہو بن کے آدمی
تم چاہے جو بھی کچھ ہو مگر رب نہیں جناب

راحت سرحدی

غزل

رات کرتی ہے اک دیا تخلیق
چہرہ کرتا ہے آئنہ تخلیق

ذہن میں ہو مزاج لفظوں کا
کرتے ہیں لفظ ہی فضا تخلیق

ہے نظامِ حیات سے ظاہر
خالقِ کن کا مدعا تخلیق

ہاں ریاضی کے قاعدے کی طرح
لا کی صورت ہوا خدا تخلیق

واقعۂ مناظرہ بے سود
در حقیقت مکالمہ تخلیق

کیسے ہم ہوں صفات میں یکساں
جب ہوئے ہیں جدا جدا تخلیق

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

غزل

سنا ہے اک جہانِ بے مکاں ہے دوسری جانب
بہت پھیلا ہوا کارِ جہاں ہے دوسری جانب

مری جانب کا سب کچھ اُس طرف محسوس ہوتا ہے
کوئی میری طرح بے خانماں ہے دوسری جانب

ابد آثار نکلی ہے ، مری تعمیر کی خواہش
ترا دریا، مری مٹی، کہاں ہے دوسری جانب؟

ستارہ سا چلا آتا ہے وہ میرے تعاقب میں
مگر اُس کی نظر سے بھی عیاں ہے دوسری جانب

اب آتی ہے خدا جانے ہزیمت کس کے حصے میں
میں اک جانب ہوں اور کارِ زیاں ہے دوسری جانب

سفر میں ساتھ رکھنا ہے مجھے اک گیت لہروں کا
خموشی سے بھرا بجرا رواں ہے دوسری جانب

دھرا ہے اُس طرف بے انت آئینہ کوئی اطہرؔ
اِدھر جو کچھ بھی ہے سارا عیاں ہے دوسری جانب

ممتاز اطہر

غزل

کبھی سوچا بھی ہے کیسے، محبت کر رہا ہوں میں
تری خاطر زمانے سے، بغاوت کر رہا ہوں میں

کہانی مختصر سی ہے مری آنکھیں ہی پڑھ لے تُو
ترے سارے سوالوں کی، وضاحت کر رہا ہوں میں

کسی کو کچھ نہیں دیتا سوائے مسکراہٹ کے
سخی خود کو نہیں کہتا، سخاوت کر رہا ہوں میں

اگرچہ دشمنِ جاں کے کٹہرے میں کھڑا ہے تو
مگر اے جانِ جاں تجھ سے، رعایت کر رہا ہوں میں

رعایا حکم میرا ماننے سے منحرف یوں ہے
کہ جیسے اِک جزیرے پر، حکومت کر رہا ہوں میں

تجھے پانے کی خواہش کے سفر کی انتہا پر ہوں
سوادِ ہجر میں رہ کر، ریاضت کر رہا ہوں میں

کوئی بھی بولنے والا نہیں اقبال حیرت ہے
یہ کس خاموش بستی کی، وکالت کر رہا ہوں میں

اقبال سروبہ

غزل

اشک کہتے ہیں کسے، اشک فشانی کیا ہے
کیا خبر تجھ کو یہ اندوہِ نہانی کیا ہے

تُو نے کیوں قصۂ بلقیس کو چھیڑا پھر سے
چارہ گر یہ تو بتا اصل کہانی کیا ہے؟

کوئی تو خُفتہ نصیبوں کو جگائے آ کر
حاکمِ شہر بتا وجۂ گرانی کیا ہے؟

میں نے برفاب میں شعلوں کو بھڑکتے دیکھا
لبِ سوزانِ جنوں، شُعلہ بیانی کیا ہے؟

کیسے سمجھاؤں تجھے شُعلۂ دل کی باتیں
سوزِ پروانہ ہے کیا؟ شمعِ جوانی کیا ہے؟

ریگِ صحرا میں کہاں جوشِ تلاطُم خیزی
کیا خبر دشت کو موجوں کی روانی کیا ہے؟

اُس نے وعدہ تو کیا پھر سے وفا کا لیکن
جعفری وعدہ ہے کیا؟ وعدۂ ثانی کیا ہے؟

مقصود جعفری

غزلیں

زندگی یونہی چال چلتی رہی
بخت والوں کی دال گلتی رہی

رنگ لائیں دعائیں بارش کی
یعنی جنگل میں آگ جلتی رہی

وائے حسرت کہ اپنی محرومی
بت نئے ذائقے بدلتی رہی

مت بُھلانا کہ وقت کی لاٹھی
کتنے سانپوں کے سر کچلتی رہی

غم کی نیت خراب تھی لیکن
اپنی قسمت کہ سانس چلتی رہی

ایک صورت گریز پا مجھ سے
میرے خوابوں میں کیوں ٹہلتی رہی

یعقوب پرواز

پیشتر اِس سے کہ کوئی کب خلاصہ کھول دے
تجھ کو میرا مشورہ ہے سب خلاصہ کھول دے

تُو تو بہتر جانتی ہے ان اندھیروں کا مزاج
مر گئی ہے پھر کہاں اے شب خلاصہ کھول دے

ان کنایوں کو سمجھنا ہر کسی کا بس نہیں
میرے کہنے کا ہے یہ مطلب، خلاصہ کھول دے

دہر یہ ہے یا مسلماں، کچھ بھی تو کُھلتا نہیں
کچھ تو ہے آخر ترا مذہب، خلاصہ کھول دے

بال کھولے رقص کرتی ہے جہاں آوارگی
بند ہونے کو ہے یہ مکتب خلاصہ کھول دے

جھوٹ پر یہ بارشِ اکرام آخر کب تلک
دیر ہے پرواز کیسی اب خلاصہ کھول دے

غزلیں

در پے آزار ہیں حالات کیا؟
زندگانی ہو گئی ہے مات کیا؟

ہو گئے پتھر کے سب کیا اہلِ دل؟
کوئی بھی سنتا نہیں ہے بات کیا؟

دائروں میں گھومتے ہیں مہر و ماہ
اک نظامِ دہر ہے دن رات کیا؟

عشق میں رسوائیاں ہیں میر جی!
عاشقی میں عزتِ سادات کیا؟

پھر صدا دیں گے ترے گیسو کو ہم
یوں جلائے گی بھری برسات کیا؟

عشق کے سارے دلائل مسترد
حسن کے آگے حوالہ جات کیا؟

ڈھونڈنے نکلے ہو شوکت تم ، خدا
ہے تمھیں حاصل شعورِ ذات کیا؟

شوکت محمود شوکت

دل میں جب سے وہ چاند چہرہ ہے
میرے اطراف میں اجالا ہے

اس سے رشتہ نہیں کوئی ، لیکن
جانے ، اپنا سا کیوں وہ لگتا ہے

ایک مجنوں ہے ، دوسرا میں ہوں
درد ، دونوں کا ایک جیسا ہے

دل کے گلشن میں ، ایک مدت سے
موسمِ ہجر کا بسیرا ہے

دل مرا باغ باغ ہے تب سے
حال ، جب سے کسی نے پوچھا ہے

یاد اپنی اسے دلانے کو
عید کے روز، پھول بھیجا ہے

مہ جبینوں کے درمیاں ، شوکت
تیرے شعروں کا خوب چرچا ہے

غزل

سیدھی سی بات ہے کہ نہیں ہم اگر غلام
جو چل رہا ہے آج بھی یہ کس کا ہے نظام

ہم تو زبان اردو بھی نافذ نہ کر سکے
مونہہ میں ہمارے ڈال دی انگریز نے لگام

خوش فہمیاں کہ قابل اصلاح ہم بھی ہیں
ہائے خیالِ خام یہ ہائے خیالِ خام

حب وطن میں، میں نے یہ غداروں سے کہا
دیوار سے لگایا تو لے دوں گا سب کا نام

غفلت کی چند گھڑیاں ہیں جو میرے پاس ہیں
اک دن تمام ہونا ہے یہ کارِ ناتمام

یارا نہیں کلام کا لیکن عبث غرور
یعنی کہ کوئی کہہ دے مجھے قادرالکلام

بہتر ہیں ہم سے سعدؔ جی کولہو کے بیل بھی
مقصد ہو جن کے سامنے چلتے ہیں وہ مدام

سعد اللہ شاہ

غزل

دیوار و در کو پھر سے سجانے کا وقت ہے
اک دلرُبا کے شام کو آنے کا وقت ہے

ٹوٹے ہوئے دلوں کو محبت سے جوڑیے
جو گر پڑے ہیں ان کا اٹھانے کا وقت ہے

چوپال سج گئی ہے الاؤ بھی جل گیا
درویش تیرا گیت سنانے کا وقت ہے

قاتل سے ڈھلتی شام کے سائے نے یہ کہا
لاشے کو اب ٹھکانے لگانے کا وقت ہے

آنکھوں کے سارے خواب ہتھیلی کو سونپیے
کوزہ گرو! یہ چاک گھمانے کا وقت ہے

یونہی یہ آنکھ آپ کے گالوں پہ جا ٹکی
ورنہ یہ میرا پھول بنانے کا وقت ہے

کچھ اس لیے بھی میں نے زمانے کی بات کی
میرا نہیں یہ وقت زمانے کا وقت ہے

یہ وقت وہ نہیں کہ ہواؤں سے لڑ پڑیں
یہ وقت بس چراغ جلانے کا وقت ہے

افتخار شاہد

غزل

اس لیے خود کو پریشان کیے رکھا ہے
تیری تفریح کا سامان کیے رکھا ہے

کیسے منہ زور جوانی کی طرح آندھی نے
رات بھر پیڑوں کو ہلکان کیے رکھا ہے

دل نے جی بھر کے جلایا ہے چراغِ جاں کو
روشنی کا کوئی امکان کیے رکھا ہے

پہلے اک شہر بسایا تھا بڑی مشکل سے
پھر اسے جنگ کا میدان کیے رکھا ہے

ہم نے باہر تو لگایا ہے یہ رونق میلا
خود کو اندر سے بیابان کیے رکھا ہے

مسعود احمد

اس نے فرما کے قدم رنجہ ذرا دیر کو پھر
دل کو بھی تختِ سلیمان کیے رکھا ہے

زندگی تو نے کئی دوسرے لوگوں کی طرح
چار دن مجھ کو بھی مہمان کیے رکھا ہے

دل کے سودوں میں تجارت نہیں دیکھی جاتی
ہم نے تو اپنا ہی نقصان کیے رکھا ہے

غزل

دکھ کی لہریں چھوڑ گیا ہے جاتا دن
تاریکی کی رَہ میں دھکے کھاتا دن

سرسوں پھوٹی یوں لگتا ہے ساجن آئے
کُہرے سے نکلا ہے دِل گرماتا دن

بے چینی سے کٹتی ہے یہ رات تمام
بے کاری میں کٹ جائے ستاتا دن

شور ہوا ہے رات کے سناٹے کا کم
خاموشی سے پھیلا شور مچاتا دن

یادوں کے کھیتوں میں پیار کی پگڈنڈی
ہاتھ پکڑ کے چلتا ، ہنستا ، گاتا دن

چوڑی ، بُندہ ناچیں تیرے آنے پر
آنکھوں میں ٹھہرا پائل چھنکاتا دن

جانے والے لوٹ کے آ بھی سکتے ہیں
گزرے گا اب مجھ کو یہ سمجھاتا دن

شبہ طراز

غزل

کام کرنے کا کر رہا ہوں میں
دل کے سب زخم بھر رہا ہوں میں

درد ہجرت ، یہ زندگی خاموش
جیسے ، جیسے گزر رہا ہوں میں

کتنے ملتے رہے ہیں درد مجھے
کتنا سینہ سپر رہا ہوں میں

شعر گوئی میں بات کرتے ہوئے
فکرِ آدم بھی کر رہا ہوں میں

آج دیکھو! شباب لمحوں میں
آپ اپنی سپر رہا ہوں میں

لامکانی شعور رکھتے ہوئے
بے بضاعت بشر رہا ہوں میں

آرزو کے طویل جنگل میں
آرزو کی ڈگر رہا ہوں میں

نظمِ حالات پر نہیں قابو
حکمرانی تو کر رہا ہوں میں

فرحت عباس

غزل [ثروت حسین کے لیے]

تیرا تن دکھیارا ہُو
تیرا من آوارہ ہُو

خون کا اک فوارہ ہُو
روشن چاند ستارہ ہُو

چہرہ دیکھ تمہارا ہُو
رویا عالم سارا ، ہُو

پانی ، مٹی ، گارا ہُو
ساتھی کون ہمارا ہُو

جانے والا ، دنیا میں
آئے گا دوبارہ ہُو

ایک حویلی گاؤں کی
جس میں اک چوبارہ ہُو

اپنے در سے آج مجھے
اس نے کیوں دھتکارا ہُو

تیرے ساتھ منافع ہے
اپنے ساتھ خسارہ ہُو

اجڑی بچڑی بستی میں
کرتا کون گزارہ ہُو

تم دنیا سے جیت گئے
میں دنیا سے ہارا ہُو

کون تمہارا دشمن تھا
کس نے تجھ کو مارا ہُو

کیسے لوگ اٹھائیں گے
جسم ہے پارہ پارہ ہُو

کوئی روز چلاتا ہے
مجھ پر اپنا آرا ہُو

پاس کسی کے خنجر ہے
خنجر بھی دو دھارا ہُو

کوئی چارہ ساز نہیں
یعنی میں بیچارہ ہُو

شہری مجھ کو کہتے ہیں
بستی کا بنجارہ ہُو

اپنے سر پہ رہتا ہے
دردوں کا پشتارہ ہُو

اس کے لاکھ سہارے ہیں
اپنا ایک سہارا ہُو

لے ڈوبا گرداب مجھے
تیرا دور کنارہ ہُو

اپنی آنکھیں کھول ذرا
دیکھ مرا لشکارا ہُو

انصر مجھ کو جانے دے
چھوڑ مرا اکتارا ہُو

انصر حسن

غزل

جب تک بھی رہے زندہ جوانی میں رہیں گے
ہم ایک محبت کی کہانی میں رہیں گے

کچھ حرف بکھر جائیں گے ہونٹوں پہ دعا کے
کچھ عکس ہیں جو آنکھ کے پانی میں رہیں گے

خوبی میں بھی ان کو نظر آئے گی برائی
کچھ لوگ ہیں جو تیر کمانی میں رہیں گے

جیسے ہمیں اس بار نکالا گیا دل سے
لگتا ہے سدا نقل مکانی میں رہیں گے

جو لوگ ہیں کشتی میں کناروں پہ لگیں گے
بہتے ہوئے دریا تو روانی میں رہیں گے

تمثیل میں کردار نبھائیں گے کسی کا
ہم لوگ کسی اور کہانی میں رہیں گے

ہم ہوں کہ نہ ہوں ساتھ، مگر عکس ہمارے
تصویر کے رنگوں میں جوانی میں رہیں گے

جس شہر بھی جائیں تری دہلیز سے اٹھ کر
ہم لوگ تو وحشت کی نشانی میں رہیں گے

لکھے گا جنھیں کوئی نہ اب درج کرے گا
کچھ درد مرے حرف زبانی میں رہیں گے

وہ لمحے ترے قرب میں جو ہم نے گزارے
ہر وقت کسی یاد دہانی میں رہیں گے

محمد اشرف کمال

غزل

اڑان بھرنے کو حسرت ہی بس بنا لیا ہے
جو گھر گھروندا تھا آخر قفس بنا لیا ہے

ترا جہان بڑا ہے ، تجھے مبارک ہو
بنا سکا ہوں میں جتنا وہ بس بنا لیا ہے

کبھی گلاب مہکتے ، صبا ٹہلتی تھی
یہ باغ جاں کہ جسے خار و خس بنا لیا ہے

کنارے کاٹ چکا ہے جو یاد کا دریا
اے دل کی موج ، اُسے ہم نفس بنا لیا ہے

روا رکھی ہیں وہی شدّتیں محبت کی
تمھارے ہجر کا لمحہ برس بنا لیا ہے

کچھ اتنا گرم یہ بازار ہے خسارے کا
ضروری شے کو بھی جس نے ہوس بنا لیا ہے

قیوم طاہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اِک شہر تھا ، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

کیا رونقِ مقتل ہے کیا شورِ سلاسل ہے
گھبراؤ نہ دیوانو اب سامنے منزل ہے

تحریرِ لہو نے یہ لکھی ہے سرِ مقتل
اس ظلم کو مٹنا ہے ، دعویٰ ترا باطل ہے

اے بچھڑے ہوئے لوگو اے اجڑے ہوئے لوگو
کچھ تم کو خبر بھی ہے کس حال میں محفل ہے

بس وار وہ کرتے ہیں پھر کب وہ پلٹتے ہیں
جانے یہ بلا ان کی کس حال میں ٹلتی ہے

چہرے پہ سجاتا ہے ہر روز نیا چہرہ
دم بھرتا ہے جو میرا اعداء میں بھی شامل ہے

کیا ڈھونڈتے ہو اس کو جس کے ہیں عیاں جلوے
بیکار بھٹکتے ہو گھر اُس کا یہی دل ہے

ایسے ہی چلے آؤ منظر میں سما جاؤ
ہے چاند بھی جوبن پر تاروں کی بھی جھلمل ہے

بتلاؤ جلیلؔ اب تو کچھ تو ہمیں بتلاؤ
کیا گزری ہے گلشن پر کیوں شورِ عنادل ہے

احمد جلیل

غزل

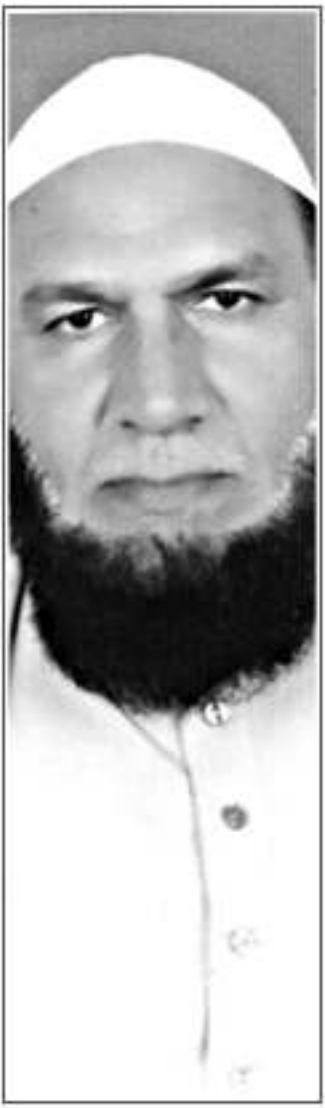

رضا اللہ حیدر

شبِ سیاہ میں مہتاب دیکھنے والے
کہاں ہیں لوگ نئے خواب دیکھنے والے

اب آئیں دیکھیں وہ سیلابِ اشک کا منظر
زمینِ عشق کو بے آب دیکھنے والے

سمندروں کے سکوں پر نہیں مچلتے ہیں
تہوں میں حلقۂ گرداب دیکھنے والے

بہت ہی دھیرے سے رکھتے ہیں پاؤں مٹی پر
زمیں کی کوکھ میں گہراب دیکھنے والے

تمھاری راہ میں آنکھیں بچھا کے بیٹھے ہیں
تمھارے عشق کے بے تاب دیکھنے والے

نصابِ دہر کی اب کس کتاب پر رکھیں
تمھارے حسن کے ابواب دیکھنے والے

فضائے رنگ میں مخمور بولتے بھی نہیں
فروزاں گوہرِ نایاب دیکھنے والے

خدا کرے کہ رضاؔ منزلوں پہ لے جائیں
سفر میں منظرِ شاداب دیکھنے والے

غزل

کیوں آسماں پہ اَبر کا ٹکڑا نہیں رہا؟
اب تو ہماری آنکھ میں دریا نہیں رہا

جلتے ہوئے چراغ میں شعلہ نہیں رہا
کوئی بھی اسکو دیکھنے والا نہیں رہا

کس عُمر میں وہ لوٹ کے آیا ہے اپنے پاس
اَب آئینہ مِلا ہے تو چہرہ نہیں رہا

پھر اپنے سارے چاہنے والے نہیں رہے
جس وقت اپنی جیب میں پیسہ نہیں رہا

عمرِ رواں پہ شام کے سائے محیط ہیں
وہ صبح کھو گئی ، وہ سویرا نہیں رہا

ہر شے مری کمائی کی بچوں نے بانٹ لی
میرا تو اپنے گھر میں بھی کمرہ نہیں رہا

خود سے لڑو کہ گھر کی ذرا خامشی مٹے
بے کیف زندگی میں تماشا نہیں رہا

یادوں کی چاندنی تھی حویلی کے آس پاس
وہ چاند کھو گیا ، وہ دریچہ نہیں رہا

ہم رُک گئے تو سر پہ کوئی چھت نہیں رہی
ہم چل پڑے تو پیڑوں کا سایا نہیں رہا

سانسوں کا آنا جانا کوئی زندگی نہیں
جس کا ضمیر مر گیا ، زندہ نہیں رہا

ٹھوکر لگی تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں
اَب اپنے پاس کوئی سہارا نہیں رہا

گلشن میں اَب کے کیسی ہوا چل پڑی عقیلؔ!
اَب تو کِسی بھی شاخ پہ پتا نہیں رہا

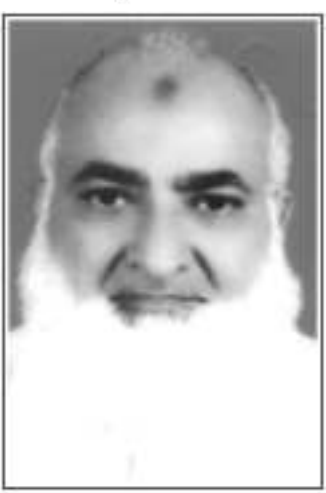

عقیل رحمانی

غزل

کنارے سے اُدھر کیسا ہے جنگل
لبِ دریا بہت سجتا ہے جنگل

حصارِ شب میں یہ سویا ہوا تھا
ہوا آئی ہے تب جاگا ہے جنگل

اگر ہو حبس کا بے جان موسم
بہت سہما ہوا لگتا ہے جنگل

ہم آدم زاد ہیں شہروں کے باسی
پرندوں کی تو بس دنیا ہے جنگل

ہر اِک موسم کا اِس میں عکس دیکھو
رُتوں کے رنگ میں ڈھلتا ہے جنگل

بہت بے رنگ تھے شاخوں پہ پتّے
بھری برسات میں نکھرا ہے جنگل

بہت پہلے سے بارش تھم چکی تھی
مگر پھر دیر تک برسا ہے جنگل

تپش بڑھنے لگی ہے بستیوں میں
مگر پھر بھی بہت ٹھنڈا ہے جنگل

بہت جاگا ہے آدھی رات تک یہ
رُکی آندھی تو اَب سویا ہے جنگل

جسے اَب تک نہیں میں ڈھونڈ پایا
کہاں ڈھونڈوں اُسے دنیا ہے جنگل

ترے لہجے کی خوشبو یاد کر کے
مری تنہائی کا جاگا ہے جنگل

بہت بے زار ہوں اُکتا چکا ہوں
حریمؔ اَب ذہن میں آتا ہے جنگل

حریم حیدر

غزل

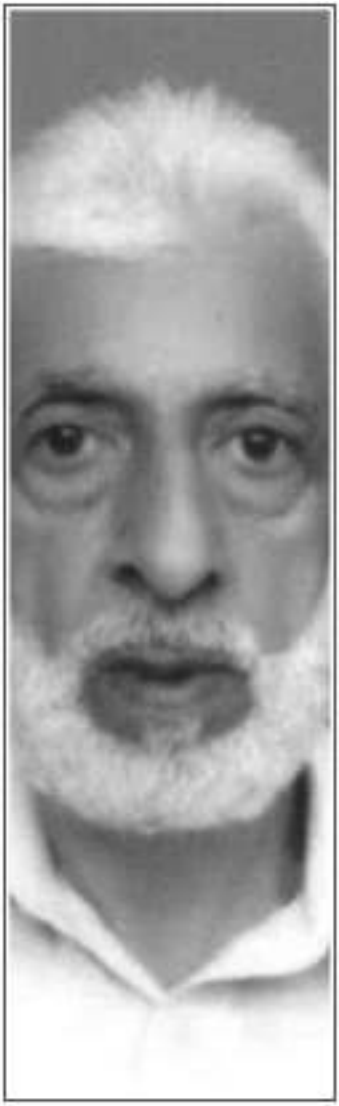

ہم فقیروں سے ملو آنکھوں کو نیچا کر کے
گفتگو ہم سے کرو لہجے کو دھیما کر کے

وہ مُلاقاتوں کے لمحے، وہ سُہانی گھڑیاں
آپ فرمائیں تو لے آؤں اکٹھا کر کے

جاؤ اُمید کے بستر پہ بچھا لو آنکھیں
میں بھی آتا ہوں ابھی جبر کو چلتا کر کے

بے بسوں پہ جو ستم ڈھاتے ہیں پل پل لوگو
ہے یہ وعدہ اُنھیں چھوڑوں گا میں سیدھا کر کے

جس کی خاطر میں نے جھیلے ہیں زمانے کے ستم
اُٹھ کے محفل سے گیا ہے مجھے رُسوا کر کے

خُوں کے دریا سے گزرنا ہے یقیناً شاہد
شعر لکھا نہیں جاتا ہے اِرادا کر کے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

جس کا جتنا قد ہوتا ہے شہزادی
سانپ وہ اتنا بد ہوتا ہے شہزادی

اُونچی ذات سے نسبت پر مت مان کرو
سب کا ایک ہی جد ہوتا ہے شہزادی

ہر بندے کی دشمن داری ہوتی ہے
ہر کوئی زیرِ زد ہوتا ہے شہزادی

خوف کے مارے بستی جاگتی رہتی ہے
جب دریا میں مد ہوتا ہے شہزادی

اب تو محشر میں ہی چل کر دیکھیں گے
کس کا پرچہ رد ہوتا ہے شہزادی

سینے میں بھی مردہ ارماں ہوتے ہیں
دل بھی اک مرقد ہوتا ہے شہزادی

ایسی موی دیکھ نہیں پاتا ارشد
جس کا تھیم حسد ہوتا ہے شہزادی

ارشد محمود ارشد

غزل

گھر کو آگ لگی تو اس نے سوچا میرے بچے
اور پھر آگ میں کود گیا وہ چیختا بچے بچے

پنجرے سے ٹکرا ٹکرا کر چڑیا نے جاں دے دی
اس کو یاد آتے تھے گھونسلے میں دو بھوکے بچے

ماں اپنے بچے کو ہی کہتی ہے چاند کا ٹکڑا
ورنہ اک جیسے ہوتے ہیں شہر کے سارے بچے

کوڑے کرکٹ میں سے دیکھو ڑزی ڈھونڈ رہے ہیں
کانٹوں میں الجھے ہیں دیکھو پھول سے پیارے بچے

بچے کی خواہش نے یارو کیسے ہوش بھلا دی
بنک میں چیک بھیجا تو لکھا مبلغ اتنے بچے

جن کی خاطر لڑنے مرنے پر تیار ہوئے ہو
وہ تو مل کر کھیل رہے ہیں پھر سے سارے بچے

گھر آنگن میں اترے اکرم دیکھے بھالے منظر
کھیل، کھلونے، شور، شرارت، پھول، غبارے، بچے

اکرم ناصر

غزل

رنگ جتنے بھی ہیں جام میں لائیے
آخری شام ہے کام میں لائیے

عشق علّت مٹانے کے درپے مگر
وہ کہے مجھ کو ابہام میں لائیے

بے سروپا رہی ہے کہانی مری
بارے چُستی تو انجام میں لائیے

جب کہ رکنا نہیں جب کہ چلنا تو ہے
تھوڑی تیزی اگر گام میں لائیے

ہم کہاں اور سعی مسلسل کہاں
ہووے مقدور تو دام میں لائیے

نااُمیدی میں تو آسرا ہے مگر
کیا تجھے ایسے ہنگام میں لائیے

ہر کوئی تو یہاں ہے یگانہ سحرؔ
خاص کو کس طرح عام میں لائیے

حسنین سحرؔ

غزل

جو ترے در سے دور جاتے ہیں
زندگی سے فریب کھاتے ہیں
رنگ ، جگنو ، گلاب ، خوشبو ، صبا
تیرے آنگن میں مسکراتے ہیں
پھول کھلتے ہیں تب خزاؤں میں
جب ترے لب پہ لفظ آتے ہیں
تیری محفل میں بیٹھنے والے
ہر جگہ تیرے گیت گاتے ہیں
تیرے عشاق تیرے اشکوں کو
اپنی پلکوں سے یاں اٹھاتے ہیں
تو جو اک بار گزرے گلشن سے
پھول شاخوں پہ مسکراتے ہیں
جن کو محفل سے تو اٹھا دے رضا
پھر وہ منزل بھی بھول جاتے ہیں

سید فرخ رضا ترمذی

ڈاکٹر علی یاسر کی یاد میں

کب یار طرح دار ہے ایسا جہان میں
میں اس کو سوچتا ہوں تو آتا ہے دھیان میں

وہ عالمِ شباب میں دنیا سے چل بسا
ایسی جدائی تو نہ تھی میرے گمان میں

ہر مصرع اس کا زندگی ہر شعر روشنی
کیا شاعری کے رنگ تھے اس مہربان میں

وہ بزم دوستاں میں مہکتا تھا ہر گھڑی
اب وہ مہک رہا ہے اُدھر آسمان میں

وہ دوست جا چکا ہے پر اس کا حسیں کلام
روشن رکھے گا اس کو سدا اس جہان میں

یاسر کی یاد سے ہے جو بے چین میرا دل
اب اور کون اس سا ملے گا جہان میں

ہوگا ہمارے ساتھ وہ ہر اک مقام پر
گو نام اس کا لکھا گیا رفتگان میں

غزل

جب التفات اس نے زیادہ نہیں کیا
میں نے بھی زندگی کا اعادہ نہیں کیا

بزمِ طلب میں یوں بھی اُٹھایا نہیں سوال
دستِ عنایت اُس نے کشادہ نہیں کیا

ہنستا ہوں، رو رہا ہوں، خبر شہر بھر کو ہو!
اتنا حروفِ ضبط کو سادہ نہیں کیا

اس کے گلاب ہونٹ مگر میں نے آج تک
خوابوں کو زندگی کا لبادہ نہیں کیا

یہ رنگ، یہ خیال سخن در سخن رہے
اک کشمکش کو زیست کا جادہ نہیں کیا

میں اس کا انتظار نہیں کر رہا حبیب
وہ جس نے لوٹ آنے کا وعدہ نہیں کیا

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسنِ محبت، حُسنِ سماعت ہے اپنے یاروں کا
دفترِ بے معنی ہیں ورنہ خالد کی تحریریں

غزل

آئنے میں رات بھر جو اک دِیا جلنے لگا
خوبیِ حُسنِ جنوں سے آئنہ جلنے لگا

مقتلِ گل گلستاں میں پھر ہوا خونِ بہار
کیا ہتھیلی پر مرے رنگِ حنا جلنے لگا

آنکھ میں حدّت بڑھا دی شعلۂ تصویر نے
آنکھ کی بھٹی میں کاجل آنکھ کا جلنے لگا

راستے سمٹے نہیں ہیں پھر بھی ہے یہ معجزہ
آبلہ پائی سے لوگو! راستہ جلنے لگا

عشق ہے دیپک سجلؔ اک طاق میں رکھا ہوا
جب چلی کیف و جنوں کی پھر ہَوا، جلنے لگا

پروین سجل

انتخاب

- خالد احمد -

جذبوں کے بادل لائیں گی یا روح یخ کر جائیں گی
کیا جانئے کس سمت سے کیسی ہوائیں آئیں گی

نعمان منظور

غزل

چھوڑ کر سب کو سرِ روئے بتاں ٹھہری ہے
دیکھو تو میری نظر جا کے کہاں ٹھہری ہے

عشق میں گفتگو کا سلسلہ تھمتا ہی نہیں
بات کرنے لگیں آنکھیں جو زباں ٹھہری ہے

پوچھیں مت کیف کے کیا کیا ہیں ہوئے دریا رواں
جب کبھی آپ کی انکاری یہ ہاں ٹھہری ہے

اس قدر تو نے ستم مجھ پہ ہیں ڈھائے کہ اب
مسکراہٹ بھی تری ایذا رساں ٹھہری ہے

آج دیکھا تمہیں تو طفلی کی گڑیوں والی
میری معصوم تمنا بھی جواں ٹھہری ہے

میں خوشی کے تمہیں نغمات سناؤں کیونکر
میرے ہونٹوں پہ تو صدیوں سے فغاں ٹھہری ہے

مجھ سے جب پالا پڑا دشتِ بلا میں اس کا
موت سی ایک حقیقت بھی گماں ٹھہری ہے

کوئی ترکیب بجھاؤ مجھے اے ہم عصرو
کس طرح جاؤں وہاں میں وہ جہاں ٹھہری ہے

سامنے اس کے نہ جانا کہ جلا ڈالے گی
اس کی آنکھوں میں ابھی برقِ تپاں ٹھہری ہے

ذکی طارق

غزل

حرف پختہ تھا ، خام تھا ہی نہیں
پر سخن کو دوام تھا ہی نہیں

عمر گزری ہے جس طرح ، اِس میں
وقفۂ صبح و شام تھا ہی نہیں

وہ ملا بھی مجھے تو ایسی جگہ
جہاں ملنے کا کام تھا ہی نہیں

مجھ سے دریا نے ایسے رُخ پھیرا
گویا میں تشنہ کام تھا ہی نہیں

عکس مبہوت ہو گئے اِتنے
آئنوں سے کلام تھا ہی نہیں

ہم کو رکھا گیا وہاں پہ ، جہاں
وقت کا اختتام تھا ہی نہیں

آگ اپنی تھی شعلگی کے بغیر
اور تپش کا تو نام تھا ہی نہیں

ہم نے سورج کو اُس جگہ رکھا
جہاں سورج کا کام تھا ہی نہیں

جس کا ہر اِک سخن بغور سُنا
مجھ سے وہ ہم کلام تھا ہی نہیں

میں وہ بازارِ مصر کا یوسف
جس کا منڈی میں دام تھا ہی نہیں

میں نے دیکھا تو عالمِ کُن میں
میرا کوئی مقام تھا ہی نہیں

نقش بر آب تھی مِری ہستی
یعنی مجھ کو دوام تھا ہی نہیں

جو تھی فہرستِ دوستاں اشرف
اُس میں اِک میرا نام تھا ہی نہیں

اشرف نقوی

غزل

وہ چل دیا تھا مرے ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے
نہ اک نظر مجھے دیکھا تھا جس نے جاتے ہوئے

وہ بزم جس میں اُڑا تھا مرا مذاق بہت
شریک تم بھی ہوئے تالیاں بجاتے ہوئے

شکستہ خواب لیے بزمِ غیر سے پلٹا
نہ دیکھ پایا تمھیں قہقہے لگاتے ہوئے

وہ دے رہا تھا مجھے بے وفائی کا الزام
مگر میں چُپ ہی رہا دل میں مسکراتے ہوئے

کہیں یہ درد کی شدت وبالِ جاں ہی نہ ہو
وہ سوچتا تو سہی زہرِ غم پلاتے ہوئے

کسی کے طرزِ تغافل سے یہ ہُوا نقصان
بھنور میں ڈوب گیا ہوں میں جاں بچاتے ہوئے

اُسے قدیم تعلق کا واسطہ جو دیا
وہ شرمسار ہوا تھا نظر چُراتے ہوئے

کہاں کہاں سے بھلا جوڑتا پھروں گا دل
میں سوچتا ہی رہا کرچیاں اُٹھاتے ہوئے

بچھا رہے تھے مرے دوست راہ میں کانٹے
میں چل پڑا ہوں، نیا راستہ بناتے ہوئے

جب آب و تاب سے اُبھرا ہے آفتابِ سخن
کسی نے غور سے دیکھا نقاب اُٹھاتے ہوئے

آفتاب خان

غزل

بستیوں کو مٹا گیا پانی
کتنی قبریں بڑھا گیا پانی

ساری دُنیا سرائے فانی ہے
یاد ہم کو دِلا گیا پانی

نظر آتی نہیں ہے جائے پناہ
اِتنی شدّت سے آ گیا پانی

ہر سماں آنسوؤں میں ڈوب گیا
اِس تسلسل سے چھا گیا پانی

تشنہ کاموں کی درد مندی کو
جامِ عبرت پلا گیا پانی

رہے خاک و ہوا تو ایک طرف
آگ میں بھی سما گیا پانی

شاد و آباد قریوں خِطّوں پر
برقِ وحشت گِرا گیا پانی

جب بھی قصدِ سفر کیا میں نے
میرے رستے میں آ گیا پانی

زلزلے سے لرز رہے تھے لوگ
بن کے سیلاب آ گیا پانی

جن کے نُسخے تھے کُشتۂ تہذیب
اُن کے پُرزے اُڑا گیا پانی

ہو گی ایسے میں کیا غزل فیضانؔ
نوحہ خوانی سکھا گیا پانی

فیض رسول فیضان

غزل

نیاز جیراجپوری

لاعلمی ، ناتجربہ کاری سے ہی ہُوا یہ گھاٹا ہے
ہم نے کھر چتوار سمجھ کر کچّا جڑ ہن کاٹا ہے

خیر ہو یارب ! لگتا ہے پھر ہَوا بدلنے والی ہے
کئی دِنوں سے شہر میں اپنے ایک عجب سناٹا ہے

خون پسینہ بہت بہائے اور کمائے کم سے کم
ہو کے بہت مجبور کِسان اب چھوڑ رہا ہَل پاٹا ہے

گلے میں پھندہ آن پڑا ہے جب سے ذِمّہ داری کا
بھُول گیا تفریح وہ تب سے ، بھُولا سَیر سپاٹا ہے

ہونے لگی ہے دُشواری پڑھنے میں اِسکوروانی سے
ایکتا کا شہکار سیاسی کیڑوں نے یُوں چاٹا ہے

اِس کو بھی جھومر، قالین اور مُجرے راس نہیں آئے
اِس تاریخی حویلی میں بھی ناچ رہا سناٹا ہے

ایسا نیازؔ اکثر ہوتا ہے جُھگّی جھوپڑ پٹّی میں
چُولہے میں ہے بھیگی لکڑی، تھالی میں گیلا آٹا ہے

غزل

چراغوں کی سیہ پوشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے
ہوا خواہوں کی خاموشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

جدا کوئی بھی کر پایا نہیں ہے رات سے دن کو
دو وقتوں کی ہم آغوشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

مگر تصویر کا گلشن بہار آثار ہے اب تک
وہی منظر کی گل پوشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کسی کو سبز رکھتی ہیں، کسی کو زرد رکھتی ہیں
رُتوں کی مصلحت کوشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

نہ جانے کب پہنچ پائے مقامِ رونمائی تک
کسی کی مجھ میں رُوپوشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

نہ فکرِ حال و ماضی ہے، نہ مستقبل کا غم شاہد
مکمل خود فراموشی جو آگے تھی سو اب بھی ہے

شاہد ماکلی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کتنی مشکل سے کوئی لفظ گہر ہوتا ہے
کتنے سینے صدف آہ و بکا رہتے ہیں

غزل

مرے سورج ترے نزدیک ہوں میں
مگر پھر بھی بہت تاریک ہوں میں

مجھے چُن لے ترا ادراک شاید
مگر نکتہ بہت باریک ہوں میں

مری دھرتی مری کیا آبرو ہے
تری مانگی ہوئی اک بھیک ہوں میں

ہمیشہ مبتلائے درد رہنا
کوئی پوچھے تو کہنا ٹھیک ہوں میں

بہت سے کام کرنا چاہتا ہوں
درونِ ذات اک تحریک ہوں میں

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی میں کسی رُخ کا ، کسی دُکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

غزل

دشت جیسا ہے اُن آنکھوں کا کشادہ ہونا
اس کو کہتے ہیں ضرورت سے زیادہ ہونا

تُو نہ سمجھے گا غمِ ہجر میں کیفیتِ دل
تُو نے دیکھا نہیں لکڑی کا برادہ ہونا

میں نے ڈالی ہے بِنا نشّۂ تنہائی کی
مجھ سے ثابت ہے غمِ ہجر کا بادہ ہونا

رشکِ حُورانِ تخیُّل ہے وہ ریشم ہو کہ سُوت
جس کی قسمت میں ہُوا تیرا لبادہ ہونا

میرا اور قیس کا تقسیم پہ جھگڑا ہے سلیم
راس دونوں کو نہیں دشت کا آدھا ہونا

محمد سلیم ساگر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم تجھ سے نئی دوری کا غم پائیں گے ہم
حادثوں کی سیڑھیاں چڑھتے چلے جائیں گے ہم

غزل

اچھا لگا تو کہہ دیا اچھا لگا مجھے
دل تک جو آ گیا تھا وہ اپنا لگا مجھے

اُس کے دیے ہوئے سبھی زخموں میں پھول تھے
اُس کا ستم بہار کا تحفہ لگا مجھے

جانے کی اُس نے بات کی، خاموش ہو گیا
لیکن اگر میں سچ کہوں غصہ لگا مجھے

کچھ اِس میں بات ہے بھلا اجر و ثواب کی؟
پانی اسے پلا دیا پیاسا لگا مجھے

کالج کے کوریڈور پر آنے لگا تھا پیار
چلتے ہوئے کسی کا جو کاندھا لگا مجھے

گزرے وہاں سے لوگ جو لوٹے نہ پھر کبھی
میں نے بھی پاؤں رکھ دیا رستہ لگا مجھے

یہ تو نہیں کہ دوست مجھے کم عزیز ہیں
لیکن وہ شخص جان سے پیارا لگا مجھے

آنکھوں میں اُس کی اور ہی کچھ داستان تھی
ہنستا ہوا وہ آدمی روتا لگا مجھے

لقموں کے ساتھ رس بھرے الفاظ بھی تو تھے
کڑوا ہر ایک ذائقہ میٹھا لگا مجھے

فخر عباس

غزلیں

لڑائی ہوتی نہیں مجھ سے سیم وزر کے لیے
ہے آب و دانہ میسر گزر بسر کے لیے

جو راستے میں کمایا وہیں لٹا آیا
بچا کے لایا تھکن ہی بس اپنے گھر کے لیے

کسی بہار کے موسم کا رائیگاں جانا
پیامِ مرگ نہیں شاخِ بے ثمر کے لیے

حضور وقت پہ ہی کام اچھا لگتا ہے
چراغ کیوں یہ چھپا رکھے ہیں سحر کے لیے

درست ہے کہ ہمیشہ نکھار لاتی ہے
محبتوں کی یہ بارش گلِ ہنر کے لیے

بہت ضروری ہے احساس میں گندھی مٹی
کہ چاک کافی نہیں صرف کوزہ گر کے لیے

فریب کھا کے بھی خلقت کہاں سمجھتی ہے
کہ تاج و تخت مقدم ہیں تاجور کے لیے

اُسے ہی کارِ مسیحائی سونپ کر خوش ہیں
دماغ ڈھونڈ رہا ہے جو اپنے سر کے لیے

اکرم جاذب

میرے شعروں میں جو منظوم نظر آتا ہے
لوحِ دل پر مجھے مرقوم نظر آتا ہے

جب لگے پیاس سمجھ لیتا ہوں پیاسا اس کو
دل بجھا ہو تو وہ مغموم نظر آتا ہے

فیصلے کرنے میں آزاد تو نہیں لگتا
میرا حاکم مجھے محکوم نظر آتا ہے

الجھنیں سونپ کے چل دیتا ہے وہ جب بھی ملے
گو بہت سادہ و معصوم نظر آتا ہے

یہ ہنر اس نے خدا جانے کہاں سے سیکھا
ظلم کرتا ہوا مظلوم نظر آتا ہے

اس کی آنکھوں میں محبت کی ضیا دیکھی ہے
کیا کسی کو کبھی معدوم، نظر آتا ہے؟

اس کی سوغات کو خیرات سمجھ کر جاذبؔ
شہر کا شہر ہی محروم نظر آتا ہے

غزل

لہو منظر ہیں دھرتی کے، نظارے بین کرتے ہیں
بڑا غمگین ہے چندا، ستارے بین کرتے ہیں

بڑی بے درد دنیا ہے بڑا ظالم زمانہ ہے
مرے ہمراہ سارے غم کے مارے بین کرتے ہیں

کبھی تو ساتھ لے جائیں ہمیں گہرے سمندر میں
پلٹ جاتی ہیں جب لہریں، کنارے بین کرتے ہیں

کیفی قلندر

ہمارے دکھ ہمارے درد کا کوئی مداوا ہو
اکیلا میں نہیں سارے کے سارے بین کرتے ہیں

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

آگ تاپی عجب ، عمر بھر ، بے طلب
جل بجھے ، اور اُٹھا دھواں بھی نہیں

غزلیں

دل ہے پتھر گمان شیشے کا
عارضی ہے بہار دنیا کی
مانگتا ہے جہان شیشے کا
عارضی ہے جہان شیشے کا

سانس بھی احتیاط سے لینا
انگلیاں کاٹ کر حکیم اپنی
زندگی ہے مکان شیشے کا
ہم نے رکھا ہے مان شیشے کا

آگ برسا رہا ہے سورج اور
سر پہ ہے سائبان شیشے کا

حکیم خان حکیم

بکتا ہے ایمان یہاں
کوئی نہیں انسان یہاں

موت کا کوئی مول نہیں
بستی میں کوئی سانپ نہیں
مہنگا ہے سامان یہاں
ڈستے ہیں انساں یہاں

محنت کرکے کھاتے ہیں
لوگوں میں احساس نہیں
کام نہیں آسان یہاں
بکتا ہے احسان یہاں

پیار کوئی بھی کرتا نہیں
لوگ ہمارے اندھے ہیں
ہوتا ہے نقصان یہاں
کون بنے سلطان یہاں

غزل

چاہتیں ہم رکاب رکھتے ہیں
ساعتوں کا حساب رکھتے ہیں

بے رخی کی وہ انتہا کر لیں
حوصلہ لاجواب رکھتے ہیں

جب بھی ملنے کی بات ہوتی ہے
منہ پہ انگلی شتاب رکھتے ہیں

یوں تو نازک مزاج ہیں ورنہ
چہرہ کھلتا گلاب رکھتے ہیں

رخِ بے پردہ صبح ہے میری
شام ہے جب حجاب رکھتے ہیں

خاکساری کی بات ہے یارو!
ہم جو بولیں کتاب رکھتے ہیں

بیتے ایام کی تلاش میں ہم
سر پہ مل کر خضاب رکھتے ہیں

نور کمال شاہ

غزل

ایک جھرنا، ایک دریا، اک سمندر دل میں ہے
خواب آگیں اس نگر کا اک کُھلا در دل میں ہے

جھلملاتے تاروں سے لپٹی ہوئی لیلائے شب
جانے کب سے اس طرح کا ایک پیکر دل میں ہے

نیلگوں سی جھیل میں نیلا ہے عکسِ آسماں
ایک منظر آنکھ میں ہے ایک منظر دل میں ہے

حادثے اتنے ہوئے محسوس کُچھ ہوتا نہیں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے سنگِ مرمر دل میں ہے

اُلجھنیں، اندیشے، خدشے، وسوسے ہیں اس قدر
دل ضرور اک اور اس دل کے برابر دل میں ہے

ایک حُسنِ بے کراں ہے، اک ادائے بے بہا
اک تصور، ہر تصور سے جو برتر، دل میں ہے

دل گیا پر آپ دل سے جا نہ پائیں گے کبھی
یادِ ماضی، فکرِ فردا سے بھی بڑھ کر دل میں ہے

راجہ عبدالقیوم

غزل

خواب اٹھا کر اپنے چار
چلتے ہیں اب دنیا پار

بات سے بندہ مر جائے
رکھ دو خنجر میرے یار

کھیل کھلونے جیسے ہم
اور کہیں ہے جن کی تار

پیاس جمی ہے ہونٹوں پر
دور تلک ہے ریت اور خار

اجلے، نکھرے کپڑے ہیں
دل کے اندر کالی غار

بابر جیون کاٹے جا
سوچ کا رکھے سر پر بار

احمد سجاد بابر

غزلیں

گلشن کی طرف سج کے نکلتا مرے آگے
ہر فرد اُسے دیکھتا، چلتا مرے آگے

ڈھل جاتے نگاہوں میں زمانے کے یہ سائے
لیکن یہ ترا بخت نہ ڈھلتا مرے آگے

اُس نے تو رقیبوں سے مرے شکوے کیے ہیں
اچھا تھا مگر زہر اگلتا مرے آگے

اک روز پہنچ جاتا ترے جسم کے نزدیک
یہ شوق جو رستہ نہ بدلتا مرے آگے

یہ فصلِ خزاں اب تو گزر جاتی چمن سے
کوئی تو شجر پھولتا پھلتا مرے آگے

اسد اعوان

شرمندہ ہے دریا کی روانی مرے آگے
گزرا ہے سبک پانی سے پانی مرے آگے

اب کون تجھے دیکھے محبت کی نظر سے
بیکار ہوئی تیری جوانی مرے آگے

حیرت ہے کہ پھر عہدِ گزشتہ کی سرِ بزم
چھیڑی ہے رقیبوں نے کہانی مرے آگے

ہر فرد کا چہرہ ہے نیا خطۂ جاں میں
تبدیل ہوئی بستی پرانی مرے آگے

مدت سے یہ خواہش ہے کہ قربت کی تپش سے
وہ برف نما شخص پگھلتا مرے آگے

غالب کو برا کہتا رہا سارا زمانہ
ہر دشمنِ جاں مجھ سے بھی جلتا مرے آگے

اک روز کروں میں بھی اسدؔ ترکِ تعلق
وہ ہاتھ بھی افسوس کے ملتا مرے آگے

معلوم نہ تھا شہرِ محبت کی، بہرطور
مٹ جائے گی ہر ایک نشانی مرے آگے

اسرارِ محبت کا ہنر آتا ہے مجھ کو
کھُل جاتے ہیں حیرت کے معانی مرے آگے

ظہرین سے میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں اسدؔ کو
بے لطف ہوئی شام سہانی مرے آگے

غزل

اُس کو چھو کر دیکھا جھونکا پاگل ہے
پائل، جھمکا، لاکٹ، کنگنا پاگل ہے

عشق کی دھوپ نے دروازے پر دستک دی
گھر سے نکلا موم کا پتلا پاگل ہے

شب بھر جاگتے ہیں دونوں اور جلتے ہیں
تُو سمجھا تھا چاند اکیلا پاگل ہے

اُس کو دیکھنے والے تو مر جاتے ہیں
پھر بھی اُس کو دیکھا ایسا پاگل ہے

اُس نے پوچھا حال بچھڑنے والے کا
میں دھیرے سے کان میں بولا پاگل ہے

برسا تو پہچان بھی اپنی کھو دے گا
بادل کا آوارہ ٹکڑا پاگل ہے

گھر سے جانے والے پھر کب لوٹے ہیں
آنکھوں سے آنسو جو نکلا پاگل ہے

میرا ہے پر میری بات نہیں سنتا
میرا دل بھی اچھا خاصا پاگل ہے

پاگل ہے جو پتھر کھاتا ہے سب سے
یا پھر تیرا شہر ہی سارا پاگل ہے

وسیم جبران

غزل

چھت نہیں ہے تو آسمان بنا
دھوپ سے ایک سائبان بنا

بے زمینی کا حظ اٹھاتے ہوئے
لامکانی میں اک مکان بنا

کربلا یوں ثمر نہیں دے گی
اِس کو اک جائے امتحان بنا

سر کٹا کر بھی اِس کو اونچا رکھ
اپنی دستار سے نشان بنا

تیر افکار کے ترازو کر
اور کردار کو کمان بنا

کھیت سینچا ہے تو بچا بھی اسے
کھیت کے بیچ اک مچان بنا

نقص ہی نقص ہیں تو چھوڑ اسے
اور اپنا نیا جہان بنا

مہربانی بھی قرض ہے پیارے
اس لیے تھوڑے مہربان بنا

میں نہ کہتا تھا جان جائے گی
ہر کسی کو نہ اپنی جان بنا

بن گئے نا ترے عدو آخر
اور یاروں کو راز دان بنا

ہو بنانا جو عکس بسمل کا
دل میں خنجر نہیں، زبان بنا

آگ کا کاروبار کھول یہاں
برف زاروں میں اک دکان بنا

میں ہی لعل و گہر بناتا رہا
ماں تو کہتی تھی خاندان بنا

علمدار حسین

غزل

دل کو چہرہ بنا لیا اُس نے
یعنی رستہ بنا لیا اُس نے

پہلے وہ یونہی بد گمان رہا
پھر وتیرہ بنا لیا اُس نے

آئینہ دیکھنا نہیں پڑتا
خود کو ایسا بنا لیا اُس نے

خشک دریا کے نقش کیا کھینچے
ایک صحرا بنا لیا اُس نے

یہ بھی تو اُس کی مہربانی ہے
اپنے جیسا بنا لیا اُس نے

عاصم اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزلیں

بات ہم نے کہی نہیں کوئی ٹھیک
راہ ہم نے چُنی نہیں کوئی ٹھیک

شاید اک عمر بعد ہو جائیں
لیکن اپنا ابھی نہیں کوئی ٹھیک

اِس جنم اُس جنم کا ذکر ہی کیا
اصل میں زندگی نہیں کوئی ٹھیک

ذرا گرمی بھی سہہ نہ پائے گا
پھول سے دوستی نہیں کوئی ٹھیک

غایتِ بزم بغض ہے تو نشست
پہلی یا آخری نہیں کوئی ٹھیک

ہر کوئی روند کر گزر جائے
اتنی بھی عاجزی نہیں کوئی ٹھیک

اے شہاب اس کباڑ خانے میں
ظاہراً ٹھیک بھی نہیں کوئی ٹھیک

شہاب صفدر

کب اہلِ مسند و عالی نصیب ڈوبے ہیں
غموں کے سیل میں بس ہم غریب ڈوبے ہیں

عذاب ہوتا تو ظلمت پرست ہوتے غرق
مگر یہ سارے سحر کے نقیب ڈوبے ہیں

وہ بے کسی کا مرقع ہیں ڈوبنے والے
کہ ان کے غم میں مسیح و طبیب ڈوبے ہیں

خدایا کیوں زدِ سیلاب پر ہیں محنت کش
خدایا کیوں ترے عبد و حبیب ڈوبے ہیں

فراز مندوں میں شامل نہیں شہاب سو ہم
گلے میں ڈالے بھنور کی صلیب ڈوبے ہیں

غزل

میری آمد پہ سجاتے تھے جو رستہ میرا
دل کیا ہے اُنھی ہاتھوں نے شکستہ میرا

بھیڑ کو اپنے خیالات بتا سکتا نہیں
ورنہ خوں پانی سے ہو جائے گا سستا میرا

کیسے تہذیبِ عزاداری سمجھ پائے گا
جس نے دیکھا ہی نہیں ماتمی دستہ میرا

بس اسی زعم میں برباد کیا ہے خود کو
موت کے کام نہ آئے تنِ خستہ میرا

روٹی ہوتی نہ تھی اور میری جماعت کے دوست
توڑ دیتے تھے بھرم کھول کے بستہ میرا

لوٹ کے آ جا مجھے چھوڑ کے جانے والے
دل تری دید کو اب بھی ہے ترستا میرا

گر مجھے یار کے پہلو میں جگہ مل جاتی
قہر خود پر نہ شب و روز برستا میرا

غیر آباد علاقے بھی بسائے میں نے
مجھ سے لیکن دلِ ویراں نہیں بستا میرا

پھر کبھی ہاتھ نہ اُٹھ پائے دُعا کی خاطر
اِتنا دشمن نے کیا پہلو شکستہ میرا

میں نے جب دودھ پلایا تھا محبت سے اُسے
کیسے ممکن تھا مجھے سانپ نہ ڈستا میرا

ازور شیرازی

غزل

ذہین عورت کی ہر نشانی جو مجھ میں دیکھی، مکر گیا وہ
تھا ہار جانے کا خوف اتنا کہ میری نظروں میں مر گیا وہ

اسے خبر تھی کہ دل کو چھونے کے بعد رستہ نہیں ملے گا
بھٹکنے والے کی سرکشی تھی پلٹ کے دل میں ٹھہر گیا وہ

وہ چاند ہاتھوں میں لے کے بولا کہو تو تم پہ نثار کر دوں
مری ہنسی میں جنون ابھرا گمان غالب ہے ڈر گیا وہ

سمجھ رہا ہے کہ اس کی خاطر یہ آنکھ نم ہے یہ شاعری ہے
شدید وحشت کو کامیابی سے میرے کاندھے پہ دھر گیا وہ

محبتوں کا شمار بھی تو عداوتوں کے جلو میں ہو گا
وہ ایک ریلا چڑھا ہوا تھا جو وقت گزرا اتر گیا وہ

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دوریوں کی آگ بھی ہم کو جلا دے گی، مگر
قربتوں کی آگ میں بھی راکھ ہو جائیں گے

غزلیں

خاک خوشیوں کی فراوانی رہے دریا میں
جب اذیت کی روانی ہے ترے دریا میں

ان کا بدلا وہی کافی تھا مرے مرنے کو
کس لیے یار مجھے پھینک گئے دریا میں

ایسا منظر جو دِل و ذہن کو حیرت بخشے
گاہ صحرا میں اسے دیکھا گہے دریا میں

رات اک شخص اُدھر تجھ سے سرافراز ہوا
اور کچھ لوگ اِدھر ڈوب رہے دریا میں

دشت کی گرم ہوا جانے مرا کیا کرتی
کھینچ لاتی نہ اگر لہر مجھے دریا میں

جو نظامِ تہِ دریا تہ و بالا کر دے
کاش وہ موج بھی اک روز اٹھے دریا میں

امتیاز انجم

دل نے تصورات سے قربت کشید کی
یوں میں نے تیری یاد کے حجرے میں عید کی

شب کا سکوت کر دیا پل بھر میں پاش پاش
مجھ سے جب اک چراغ نے گفت وشنید کی

سر پر جو اس کے باپ کا سایہ نہیں رہا
میت پہ رو رہی ہے وہ بیٹی شہید کی

پھولوں کی میرے شہر میں کثرت تو تھی مگر
لوگوں نے تیرے نام کی خوشبو خرید کی

ارسلان ساحل

غزل

اِک نئے باب کا آغاز ہوا چاہتا ہے
اِک ستارہ مرا ہمراز ہوا چاہتا ہے

دوستا! مان لے اب تو مرا ہونا خود میں
اب تو دشمن مری آواز ہوا چاہتا ہے

اب یہاں میرا ٹھہرنا نہیں ممکن لگتا
تیرا دل دعوتِ شیراز ہوا چاہتا ہے

جو سمجھتے تھے اِسے کارِ زیاں ان کے لیے
شعر گوئی مرا اعزاز ہوا چاہتا ہے

گا رہا ہوں مَیں محبت کے ترانے دل سے
ایک عالم مرا دم ساز ہوا چاہتا ہے

اس کو ہونے لگی محبوب مسیحائی مری
کس تفاخر سے یہ اعجاز ہوا چاہتا ہے

سن رہا ہوں مَیں کچھ ایسا کہ سبھی کہتے ہیں
نازش! اب تم پہ ہمیں ناز ہوا چاہتا ہے

شبیر نازش

غزل

کچّے گھر کچّی گزرگاہ ہوا کرتی تھی
آنے جانے کی مگر چاہ ہوا کرتی تھی

وقت ہی وقت تھا مل بیٹھ کے کہ سُننے کا
رِت ملاقات سرِ راہ ہوا کرتی تھی

کتنی دلچسپ سی ہوتی تھی ہر اِک تازہ خبر
کیا تجسّس بھری افواہ ہوا کرتی تھی

دن ڈھلے جب میں کہیں جگنو پکڑنے جاتا
ایک تتلی مرے ہمراہ ہوا کرتی تھی

جس گلی سے ترا اِک بار گزر ہو جاتا
ہر قدم پر مری درگاہ ہوا کرتی تھی

کیا زمانہ تھا کہ ہر چیز میں برکت تھی امر
جب کہ معمولی سی تنخواہ ہوا کرتی تھی

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزل

تو سمجھتا ہے اسے خاک اڑانے کے لیے
موسمِ ہجر بھی ہے پھول کھلانے کے لیے

ایک ہی در ہے جہاں اب بھی جھکا دیتا ہوں
دلِ آوارہ کو اوقات میں لانے کے لیے

اشک در اشک کئی خواب بہے جاتے ہیں
ہجر تیار نہیں ان کو بچانے کے لیے

وقت بے وقت مرے دل نے ریاضت کی ہے
ہاں کسی شخص کو امکان میں لانے کے لے

زخم ہوں، اشک ہوں، تارے ہوں سجاتا ہوں ایاز
دامنِ مژگاں کی توقیر بڑھانے کے لیے

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد مجھے منظور نہ تھا جاں سے گزرنا
گھر بیٹھ رہا باندھ کے پیمانِ وفا میں

غزل

اتنی رکھتا ہے جو انا تُو بھی
سمجھا خود کو ہے کیا خدا تُو بھی

تُجھ کو خود پر گمان ، اُف اللہ!
ہو گا اِک دن مگر فنا تُو بھی

کوئی تجھ سا حسیں نہیں ، مانا
دل سے لیکن اُتر گیا تُو بھی

دل ہے میرا صنم کدہ ، جانم!
آ کے رونق ذرا بڑھا تُو بھی

ظلم سہتا رہا ہوں یاروں کے
کر لے کرنی ہے جو جفا، تُو بھی

اب تو دل میں خزاں کا موسم ہے
لگتی صرصر ہے اے صبا! تُو بھی

مُجھ کو زلفوں کی مل گئی چھاؤں
جا کے لے آ کوئی گھٹا تُو بھی

غیر تو کام آ ہی جاتے ہیں
کر دے کچھ تو مِرا بھلا تُو بھی

اب کے شاید وہ لوٹ ہی آئے
ایک دے دے ذرا صدا تُو بھی

موت رقصاں ہے اُس کی گلیوں میں
اب تو خطرے میں ہے ضیاؔ تُو بھی

سید ضیا حسین

غزل

دُعا سے دُور ، خلا میں کہیں معلق ہے
یہ میرے وہم کا کتبہ یہیں معلق ہے

دکھائی دیتا ہے اُلٹا ہماری آنکھوں کو
کہ آسماں ہے تحرک ، زمیں معلق ہے

نئی صدی کے تقاضوں میں روشنی کا سفر
جدید عہد کا گوشہ نشیں معلق ہے

سرُور آتا نہیں من کو کوئی بھاتا نہیں
پری سا ، چاند سا ٹکڑا حسیں معلق ہے

رواں دواں ہے گماں کا یہ سلسلہ لیکن
نجانے کب سے ہمارا یقیں معلق ہے

فشارِ ذات کے ٹکڑوں سے کیا ملا بابر
یہ کج روی بھی تو یکسو نہیں ، معلق ہے

امجد بابر

غزلیں

تیری تو بات، بات سے، ہے مجھ کو اختلاف
ہر بات میں ثبات سے، ہے مجھ کو اختلاف

تیرے کرم سے آتی ہے، بدلے کی بو مجھے
سو! ان معاملات سے، ہے مجھ کو اختلاف

ہوں جس کی، بیٹھے گھات میں، سارے گناہ گار
ایسی اندھیری رات سے، ہے مجھ کو اختلاف

ہو جن میں درجہ بندی، امیر و غریب کی
ایسے تعلقات سے، ہے مجھ کو اختلاف

ہر چال میں ہی مات ہو گل! میرے شاہ کی
ایسی بچھی بساط سے، ہے مجھ کو اختلاف

کوکی گل

ہوائیں مجھ کو ملیں، روشنی بھی میری ہو
یہ ابر میرے لیے ہو، فضا بھی میری ہو

جب آسمان میسر ہے بے طلب مجھ کو
تو کیوں نہ پاؤں تلے کی زمیں بھی میری ہو

میں تیرے ساتھ چلوں جب دھنک کے رنگوں پر
وہ رنگ اور تری دلکشی بھی میری ہو

اگر سماج مری موت مر نہیں سکتا
تو پھر جیوں میں جسے، زندگی بھی میری ہو

نہیں دوام میسر صدائے باطل کو
جو گونج بن کے رہے، خامشی بھی میری ہو

رافعہ ارم مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لے جائیں گی کہاں مجھے تنہائیاں مری
وسعت پزیر ہیں ابھی پہنائیاں مری

غزل

میں جانتا تھا کبھی یاد کر کے روئے گا
وہ ایک روز مجھے آنکھ بھر کے روئے گا

وہ دل کا حال چھپائے گا کیسے چہرے سے
وہ آئنے کے مقابل سنور کے روئے گا

زمیں نژاد کو اس کی خبر نہ تھی معلوم
وہ آسمان سے نیچے اتر کے روئے گا

سنا ہے فصلِ چمن اب کے خوف بوئے گی
گلاب موسمِ گل میں نکھر کے روئے گا

اسے ضمیر ملامت کرے گا بالآخر
وہ مجھ پہ دیکھنا الزام دھر کے روئے گا

مجھے خبر ہے وہ کچا ہے عہد و پیماں کا
وہ اپنے قول سے لیکن مکر کے روئے گا

وہ بے خبر ہے ابھی خار زارِ الفت سے
وہ دشتِ عشق سے دانش گزر کے روئے گا

اعجاز دانش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پالنوں کی عمروں سے اب ہمیں نکلنے دے
خاک میں لتھڑنے دے پاؤں پاؤں چلنے دے

غزل

پیار میں ایسا لگے وہ بھی فنا ہو جیسے
میری چاہت پہ وہ راضی بہ رضا ہو جیسے

یاد آئی جو تری ایسا لگا جانِ چمن
دل کی ڈالی پہ کوئی پھول کھلا ہو جیسے

رنگ چہرے کا ترے دیکھ کے یوں لگتا ہے
تجھ کو زنجیر تری آج حنا ہو جیسے

اب ملاقات پہ شکوے بھی نہیں کرتے ہو
ایسے لگتا ہے کہ تم مجھ سے جدا ہو جیسے

آنکھ اٹھتی ہی نہیں اور کی جانب میری
دل کہ بس آپ کی چاہت پہ فدا ہو جیسے

تنگ آجاؤں اگر اپنے ہی جذبوں سے کبھی
یوں سمجھتا ہوں کہ تو مجھ سے خفا ہو جیسے

اس کو بھی اپنی وفاؤں پہ یقیں تھا ایسا
میری ہی طرح سے دھوکے میں رہا ہو جیسے

بزم میں چپ رہوں تو بھی وہ سمجھ لیتا ہے
حرفِ دل میری نگاہوں سے ادا ہو جیسے

عشق کا روگ ہمیشہ ہی بسا تھا مجھ میں
دل محبت بھرا سینے میں ملا ہو جیسے

گھر میں پھیلی ہے ترے جسم کی خوشبو ہر سو
میرے سینے سے ابھی تک تو لگا ہو جیسے

غم بھی اِس درجہ اٹھائے ہیں کہ غم رونے لگے
غم کی چیخوں سے مرا گھر ہی بھرا ہو جیسے

بے وفائی پہ تری میں نہیں مغموم ہوا
ختم ہو گا یہ تعلق بھی پتہ ہو جیسے

ایسے گلیوں میں بھٹکتا ہوں شہاب اللہ میں
تو نے رستے میں مجھے چھوڑ دیا ہو جیسے

شہاب اللہ شہاب

غزل

آنکھ میں عکس تمھارا ہوتا
منظر کتنا پیارا ہوتا

نیندیں گر یہ گہری ہوتیں
چاک سے خواب اُتارا ہوتا

جھیل کنارے بیٹھے ہوتے
دلکش ایک نظارا ہوتا

تیرے ساتھ گزارا کرتے
پھر تو خوب گزارا ہوتا

غیروں سے پھر کیوں ملتا وہ؟
مخلص یار ہمارا ہوتا

بیچ بھنور میں ہم تم ہوتے
میلوں دور کنارا ہوتا

والدین جو زندہ ہوتے
شاہد خواب سہارا ہوتا

رانا محمد شاہد

بارش اور پری [کہانی]

پری لو وہ ڈاک بنگلہ نظر آ گیا۔
دیکھ، گاڑی کی روشنی میں برستی بارش کچھ دیکھنے نہیں دیتی۔ ''وائپر'' شیشے پہ تھرک تھرک کے تھک گئے، کیسے چوں چوں کرتے۔ یہ دیوار آ گئی ڈاک بنگلہ کی، ذرا آگے اس کا گیٹ۔
دعا کرو کھلا ہو۔
او، گیٹ آ گیا، بند ہے۔
ہارن دیتا ہوں، کوئی آئے گا۔
پہاڑی علاقہ یہ، یہاں روز شام سے بارش ہوتی ہے، گرمیاں ہوں یا سردیاں، اِدھر ہر شام برسات۔ لو اتنے ہارن بجائے، اندر کوئی بندہ ہلتا نظر ہی نہیں آیا۔
میں خود اتر کے کھول لوں، گیٹ؟
نہیں بھیگنا زیادہ۔
مجبوری ہے۔
لو، اترتا ہوں، تو فکر نہ کر، پری۔
گاڑی کے اندر بیٹھی تم سردی سے کیسے کپکپا رہی تھی، حالانکہ گاڑی تو گرم تھی۔ تم باہر برستی بارش کے احساس سے اندر بیٹھی ٹپ ٹپ برس رہی تھی۔ مجھے تمہاری بوندا باندی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے بازوؤں میں تمہیں ساتھ بھینچ کے، تمہارے گلاب گال چومے تھے۔ یاد؟ تم نے ہڑبڑا کے چہرہ میری طرف گھمایا تو میرے ہونٹ تمہارے ملائم گالوں سے سرک کے تمہارے ہونٹوں کی کنیوں کو چھو گئے تھے۔
اُف،
کیسے نرم جوس بھرے تیرے ہونٹ۔ لگتا تھا، چوم لیے تو تیرے ہونٹوں کے رس سے میرا منہ بھر جائے گا۔ تمہیں چوم کے تیز بارش میں گاڑی کا دروازہ کھولا تو، بارش کے چھینٹے تیرے چہرے تک آئے تھے۔
لکڑی کا چوڑا سا وہ گیٹ میں نے بھاگ

ابدال بیلا

کے جا کھولا، اُس کے اوپر ہک لگا تھا، وہ ٹھک کر کے اُٹھا اور گرا، دروازہ کھولا تو کوئی چوں چاں نہیں ہوئی۔ بارش سے وہ بھیگا ہوا تھا۔ پورا کھول بھی دیا تو سرک کے بند ہوئے جائے۔ تیز بارش میں، میں سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔ گیٹ کے کنارے پہ پڑی ایک اینٹ سے اُس کا ایک پٹ روکا۔ دوسرے پٹ کے لیے بھی ایک ٹوٹی اینٹ ملی۔ گیٹ پورا کھول کے میں بھاگ کے پھر گاڑی میں آیا تو تم مجھے بھیگے دیکھ کے ہنسنے لگی۔ گاڑی کی باہر گیٹ پہ پڑتی روشنی سے بھی تو گاڑی کے اندر بیٹھی بیٹھی ایسی گڑیا سی لگ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا، تمہیں زور سے گلے لگا کے اپنے سارے گیلے کپڑے تم میں نچوڑ دوں۔

یاد۔

تمہیں گاڑی میں بیٹھتے ہی پھر گلے لگانے کے لیے تمہارے گرد بازو کیے تو تم اپنے ہی اندر ایک دم سے یوں سکڑ گئی، جیسے جادو کی کوئی گڈی ہو، نہ نہ کرتی ہوئی تم اپنے بازوؤں سے اپنے گرد اک حصار اُوڑھ کے میری گیلی بانہوں میں بچک کے بیٹھ گئی۔ اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

پری تم ہنستی ہو تو لگتا تیز گنگناتی بارش ہو رہی ہو، اُس وقت تو بارش بھی تھمی تیز، سوچو، تمہاری ہنسنے کی آواز کس قدر طوفان مچا رہی ہوگی۔ مجھے یاد، اُس لمحے آسمان پہ زور کی بجلی کی لہر گاڑی کی ونڈ سکرین پہ مچلی تھی، بادلوں کے کڑکنے کے ساتھ ہی تم اپنے بازوؤں کا حصار کھول کے میرے بازوؤں میں آ گئی تھی۔ مگر گاڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ بارش کے چھینٹوں سے گاڑی کی سیٹ اور تم بھی گیلی ہوئی جا رہی تھی۔ تب میں نے دروازہ بند کر کے گاڑی گیٹ سے اندر کی تھی۔

ہارن بجانے پہ پھر بھی اُدھر چوکی دار نہ آیا۔

یاد کیسا ویران سا وہ ڈاک بنگلہ تھا۔

دیواروں کی سفیدی اُتری ہوئی۔

تیز بارش میں ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

خستہ سا وہ پورچ اوپر چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ نیچے اینٹوں کے فرش پہ گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ میں اُدھر گاڑی سے اُترا۔

چھپڑ چھپڑ کھڑے پانی میں پاؤں ہلے۔

اِدھر اُدھر دیکھ کے آوازیں دیں۔

کوئی ہے؟

اور تم تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہارن بجا دیتی تھی۔

ہارن کی آواز گونج گونج کے واپس آتی۔

یاد، اندر برآمدے سے پھر ایک نیلی ڈبیوں والا میلا سا کھیس لپیٹے بندہ ہولے ہولے قدم اٹھا کے ہماری طرف آیا تھا۔

ڈاک بنگلہ کے کمرے کی چھت کتنی اونچی تھی۔ تم سر اُٹھا کے اُسے دیکھ کے مجھے پوچھنے لگی، آج کل ایسی اونچی چھتیں کیوں نہیں بناتے؟

میں نے سامان الماری میں رکھتے ہوئے، ہنس کے کہا تھا، تمہارے جیسی "پریاں" اب کدھر رہ گئیں۔ جنھوں نے اڑنا بھی ہوتا۔ ادھر تم اڑ کے چھت کو چھو آؤ پھر ادھر بیٹھ کے میرے ساتھ آگ سے ہاتھ تاپنا۔

یاد ہے،

اُسی لمحے دروازہ کھلا تھا اور چوکی دار آگ کی انگیٹھی میں پھونکیں مارتا، دھوئیں کا بادل اٹھائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

پری، اُس آگ کا کالا کالا دھواں بھی کیسا گرم تھا، وہ انگیٹھی رکھ کے چلا گیا اور تم اُس کے اوپر آنکھیں میچے ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ تمہاری ہیرے کی طرح چمکتی آنکھوں میں دھواں پڑا تو کیسے پلکیں پھڑ پھڑا کے کپکپائی تھیں۔ تمہارے گلاب پتی سے نرم گالوں پہ تمہارے مسکرانے سے گڑھے پڑ گئے تھے۔ تمہیں تھوڑی یاد ہو گا کہ تمہارے ہونٹ کیسے اک دوسرے کو بھینچ کے مسکرائے تھے۔

میں نے دو کرسیاں لا کے، آگ کے ساتھ رکھیں تھیں۔ تم کیوں پھر اپنی کرسی پہ بیٹھنے کے بجائے، میری گود میں آ گھسی تھی اور پھر وہیں کپکپا کے چھوٹی موئی سی سکڑ کے بولی تھی، تم تو سارے گیلے ہو۔

تم بھی گیلی ہو جاؤ،

یاد، یہ کہہ کے تمہیں میں نے بازوؤں میں لے لیا تھا۔

پری،

تم سر سے پاؤں تک پھول پتیوں سی بنی ہو کیا؟

اتنی نرم، گداز اور رسیلی۔

تمہارے سارے کپڑے بھی گیلے ہو گئے۔

تم سردی سے کپکپائی تو تمہارے ہونٹ بھی تھرتھرائے تھے۔ سردی کی لہر تمہارے جسم میں کدھر سے آئی؟ میں تمہیں بازوؤں میں دباؤں تو تم اور گیلی ہو۔ تمہارے سنہرے بال ایک دم سے تمہارے سکارف سے اُبل کے باہر آ گئے تھے، جب سکارف کا پکڑا اسرا، سرکا۔

پری، تم نے یہ سنہرا پن کہاں سے لیا؟

تم سے یہی پوچھا تھا یا کچھ اور، جب دروازہ ہلتے دیکھ کے تم ہڑبڑا کے میری گود سے اچھل کے نکلی تھی اور اپنے بال پھر سے سکارف میں ڈھانپنے لگی۔

اُس وقت تم نے چوکی دار سے کھانے کا پوچھا تھا۔ پری، تمہاری باتیں سن کے جب وہ چلا گیا تو میں نے تمہیں کہا تھا، کپڑے

بدل لو، گیلے ہیں یہ۔ تم نے اپنی آنکھوں میں شرارت کی قندیل جلا کے، مجھے کہنی ماری تھی۔ اور کہا تھا، پہلے تم بدلو، کپڑے۔

اُف، پری، یہ پتہ نہیں کیوں اُس لمحے مجھے لگا ہم دونوں گیلے ہوئے، اپنے گیلے کپڑے اتار کے، اُسی گیلے پن پہ لت پت ہو گئے ہیں۔

کمرے میں اک پیلا سا بلب جل رہا تھا۔ کمرے کے بیچ انگیٹھی میں پڑی آگ سے دھواں اٹھ کے کمرے کے روشن دان کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ اُس پیلی مدھم سی روشنی میں تم سر سے پاؤں تک آئل پینٹ سے بنی کوئی قدیم عجوبہ شاہکار پینٹنگ لگ رہی تھی، جب تم شرمائی ہوئی اپنی بانہوں میں چھپی، ٹانگوں کو اک دوسرے میں دیے، کپڑے بدل رہی تھی۔

وہ لمحہ انمول تھا۔

ویسا منظر رنگ برش ہاتھوں میں لے کر بناؤں تو وہ تصویر ایسی ہو، جس پہ تم خود ہی، خود پہ عاشق ہو جاؤ۔ ویسے پری، سچ بتا، تمہیں اپنے آپ سے عشق ہے کہ نہیں؟

ہے نا؟

ہونا بھی چاہیے۔

ایسا بدن جس کا ہو، اُسے اور کسی کا بدن کیوں چاہیے پھر؟ لیکن تمہارے جسم میں اتنی تکمیل کے بعد بھی اک پیاس تھی۔

لو، اتنی سردی میں بھی ہم دونوں کے ہونٹ سوکھے تھے۔ سردی میں ایسی پیاس کیوں لگتی، پری؟

پری، تم اپنے بیگ کے بجائے، میرے بیگ سے میرا سلیپنگ سوٹ کیوں پہن کے کھڑی ہو گئی، توبہ، کھلے کھلے سے اُس سوٹ میں لپٹی تم ایسے لگ رہی تھی جیسے تم نے مجھے پہن لیا ہو۔

میرے بازوؤں میں اپنے بازو ڈال کے تم کیسے انہیں لہرا کے ہنس رہی تھی۔

میرا پاجامہ اوپر پیٹ تک لاتے ہوئے بھی تم اپنے پیروں میں اُس کے پائینچے پھیلے دیکھ کے ہنسی تھی۔ یاد، میں نے جھک کے تیرے پیروں سے پاجامہ تمہارے ٹخنوں تک رُول کر دیا تھا اور تمہارے ملائم گداز چھوٹے چھوٹے پاؤں پہ کتنی دیر تک ہاتھ پھیرتا رہا تھا۔ لگتا تھا تمہارے پیر میرے ہاتھوں میں رس ٹپکنے لگیں گے۔ تمہیں اُس وقت کہا نہیں، مگر دل میرا چاہ رہا تھا، تیرے پیروں پہ اپنے ہونٹ رکھ کے انہیں چوس لوں۔ لگتا تیرے پیروں نے یہ سن لیا تھا، اسی لیے میرے ہاتھوں میں تھرک کے چپکے سے کھسک گئے تھے۔

اُس رات میں نے اک لونگی ہی باندھی تھی۔ اوپر ایک کھلی سی شرٹ تھی۔

تم کھانا کھانے لگی تو بولی، اپنی کہانی سناؤ، شروع سے۔ میں ہنسنے لگا۔

تم بولی ہنسے کیوں؟

میں نے کہا، شروع کہاں سے شروع کروں؟ یہ سوچ رہا تھا۔

تب تم بھی ہنسی تھی۔ تم بولی، شروع سے شروع۔

تمہاری مسکراہٹ عجیب سی تھی۔

جیسے یک لخت کلیاں، اپنے وجود میں ایک طوفان لا کے، اپنی پتیاں کھڑ کھڑا کے کھول دیں۔ چاروں طرف اپنی خوشبو کی پھوار سے ہر دیکھتی آنکھ کو خوشی سے نم کر دیں۔ پری، تمہاری مسکراہٹ جیسی مسکراہٹ کہیں اور دیکھی ہی نہیں - کیسے بتاؤں تم کیسے مسکراتی؟

تمہارے گلاب پتیوں سے، ہیرے کی کنی سے کٹے ہونٹ، ایک دم سے کناروں سے گالوں میں دب جاتے، آپس میں زور سے گلے ملتے، گالوں میں گڑھے پڑ جاتے اور دونوں ہونٹ رس بھری قاشوں کی طرح اپنا رس نچوڑنے لگتے۔

پری، تم اپنی مسکراہٹ کا سارا میٹھا جوس خود ہی پی جاتی۔ تمہارا انگ انگ اُس رس کی پیوندکاری سے کھلکھلا جاتا۔ آنکھوں میں پورن ماشی کا چاند اتر آتا۔ تمہاری لمبی چکنی گوری گردن تھوڑی اور اُٹھ جاتی، تمہارے سینے پہ سانسوں کے پھول، پھول جاتے۔

اتنی سی اک مسکراہٹ سے، تمہارا سارا وجود اک گلدستے کی طرح مہک جاتا، چہک جاتا۔ پری یہ سب کیسے تم نے سیکھا؟

تم بات کرنے سے پہلے، جو سوچتی، وہ سوچ تمہارے بدن پہ لکھی، پڑھ لیتا۔ پری، بہت کم تم وہ بات کرتی، جو بات کرنے کا سوچا ہوتا تم نے۔

ہے نا؟

مجھے کیا۔ میں تیرے لبوں سے کہی کی نسبت، تیرے بدن سے نہ کہنے والی تیری بات بھی سُن لیتا ہوں۔ تمہیں بھی تو میری ”اَن کہیاں“ سمجھ میں آتی ہیں۔

شروع سے شروع تو یوں ہوا کہ ایک پڑوسن مجھے انگلی سے لگا کے اپنے گھر لے گئی۔

تم کیوں ہنس کے اپنے بدن میں سمٹ کے چھپ رہی ہو؟ وہ بھی چھپتے چھپاتے مجھے پکڑ کے لے گئی تھی۔ بچہ تھا گھسٹتا چلا گیا۔

بس وہ انکشاف کا لمحہ تھا۔

اُدھر بھاگنے دوڑنے والی لڑکیوں کے بدن میں کیسے پھل چھپے۔

مگر تم کہاں چھپ گئی؟

پری!

دیکھ، بارش کتنی تیز، چھت بھی ٹپکنے لگی۔

☆☆☆☆☆

بوڑھا باورچی [روسی کہانی]

1876 کی سردیوں کی ایک شام کو ایک نابینا بوڑھا شخص کاؤنٹیس تھن کا ایک پرانا باورچی وی آنا کے بیرونی حصے میں ایک چھوٹے سے کاٹھ کے گھر میں قریب المرگ تھا اگر یہ کہا جائے کہ یہ گھر نہیں تھا بلکہ باغ کے عقب میں ایک گرنے کے قریب چھپر تھا۔ باغ کے چاروں جانب ہوا کے دوش پر آئی ہوئی سُوکھی ٹہنیاں بکھری پڑی تھیں۔ ہر قدم پر جب یہ ٹہنیاں کڑکڑ کرتیں تو رکھوالی کرنے والا بوڑھا کُتا اپنے کُتے خانے میں دھیمی آواز میں گھُر گھُر کرنے لگتا۔ وہ بھی اپنے مالک کی طرح بڑھاپے کی وجہ سے مرنے کے قریب تھا۔ اب تو وہ بھونک بھی نہیں سکتا تھا۔

اب سے کچھ برس پہلے کام کے دوران بھٹی سے برآمد ہوتی سخت آنچ نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ تب کاؤنٹیس کے مالک نے اُسے اس کوٹھے میں پہنچا دیا تھا اور وہ کبھی کبھار کچھ پیسے بھی دے جاتا۔

بوڑھے باورچی کے ساتھ اُس کی اٹھارہ برس کی بیٹی بھی رہتی تھی۔ اُس کے کمرے کا سامان ایک چارپائی۔ کچھ انتہائی پرانے بینچ، ایک کھدری سی میز، کچھ ٹوٹے ہوئے مٹی کے برتن اور ماریا کے ایک تنہا ساز ہارپسی کارڈ پر مشتمل تھا۔

ماریا کا یہ ساز اتنا پرانا تھا کہ اس کے اردگرد کہیں سے بھی کچھ شور ہوتا تو اس کی گونج اس کے تاروں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتی۔ باورچی اسے مذاق کے طور پر اپنے گھر کا پہرے دار کہا کرتا تھا۔ جب کوئی اس کے گھر میں داخل ہوتا تو یہ ساز اپنی کانپتی ہوئی بوڑھی گونج سے اس کا استقبال کرتا۔

کونستاں پوستووسکی

مترجم: حنیف باوا

جب ماریا نے اپنے قریب المرگ باپ کو نہلا کر ایک ٹھنڈی اور صاف قمیض پہنا دی تو بوڑھے نے کہا میں تسلیم کرنے کے لیے اُن میں سے کسی کو بھی نہیں بُلا سکتا۔ لیکن پھر بھی میں مرنے سے پہلے اپنا ضمیر شفاف کرنا چاہتا ہوں۔

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔'' ماریا نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا

''تو باہر سڑک پر جا۔'' بوڑھے شخص نے کہا۔ ''تجھے جو پہلا آدمی ملے۔ اُسے کہنا کہ وہ ہمارے گھر میں آئے اور مرنے کے قریب آدمی کی ایک گزارش سُن لے۔ کوئی تمھیں انکار نہیں کرے گا۔

''ہماری سڑک پر تو کوئی شخص ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا'' ماریا نے دھیمی آواز سے کہا لیکن پھر وہ اپنے اوپر ایک شال اوڑھ کر باہر نکل گئی۔ باغ میں وہ بھاگتی ہوئی گئی۔ جنگلے کا دروازہ اُس سے مشکل ہی سے کھولا گیا تو پھر وہ وہیں پر رُک گئی۔

سڑک خالی تھی۔ ہوا پتوں کو اُڑا کر لے جا رہی تھی اور تاریک آسمان سے ٹھنڈی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ ماریا بڑی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ اب وہ کوئی آواز سننے کے لیے بے قرار تھی۔ پھر اُسے لگا جیسے باڑھ کے ساتھ ساتھ کوئی شخص گنگناتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ چند قدم اُس کی اور بڑھی۔ جب وہ اُس کے قریب پہنچ گئی تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ جب وہ شخص رک گیا تو اس نے اُس سے پوچھا

''کون ہیں آپ؟''

ماریا نے اُس کا بازو زور سے پکڑا اور کانپتی آواز میں اپنے والد کی گزارشات اُس کے سامنے رکھیں۔

''اچھا۔'' اس شخص نے نرم لہجے میں کہا۔ میں پادری نہیں ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چلو چلیں۔''

وہ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ موم بتی کی روشنی میں ماریا نے دیکھا۔ وہ ایک چھریرے بدن اور چھوٹے قد کا شخص تھا۔ اُس نے اپنا گیلا چوغہ بینچ پر رکھا۔ اُس کا لباس سادہ ہونے کے باوجود بہت شاندار لگ رہا تھا۔

وہ اجنبی شخص پورے جوبن پر تھا۔ اُس نے لڑکوں کی طرح اپنے سر کی جنبش سے اپنی پاؤڈری سے اٹی ہوئی وگ کو درست کیا اور ایک سٹول کو تیزی سے اپنے قریب کر کے اُس پر بیٹھ گیا۔ اور پھر اُس نے سر نہوڑا کر اُس قریب المرگ بوڑھے کی جانب بڑے غور اور خوشی سے دیکھا۔

''بولو۔'' اُس نے کہا۔ شاید یہ دین مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ اُس فن نے عطا کی، جس کی میں سیوا کرتا آ رہا ہوں تا کہ

میں آپ کے آخری پل آسان کر سکوں اور آپ کی روح پر پڑے بوجھ کو اُتار سکوں۔

''میں اندھا ہونے سے پہلے ساری زندگی کام کرتا رہا ہوں۔'' بوڑھے شخص نے آہستہ سے کہا، جو شخص ہر وقت کام میں مصروف رہا ہے اُسے گناہ کے ارتکاب کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جب میری شریک حیات جس کا نام مارتھا تھا ہپ دق نے اپنے چنگل میں لے لیا تو ڈاکٹر نے اس کے لیے بہت مہنگی دوائیں تجویز کیں اور کہا کہ اسے کھانے کے لیے بالائی اور انجیر دی جائے اور پینے کے لیے سرخ شراب۔ اُن دنوں میں نے ایک سونے کی طشتری چوری کی اور اُسے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بیچ ڈالا۔ اب مجھے اُس چوری کے ارتکاب کی یاد بہت ستاتی ہے۔ جسے اپنی بیٹی کو بتاتے ہوئے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اسے تو میں نے یہی سبق دیا کہ کسی اور کی میز پر پڑی دھول کے ایک ذرے تک کو بھی نہیں چھونا چاہیے۔

''تو کیا کاؤنٹیس کے کسی نوکر کو اس کی سزا بھگتنی پڑی تھی۔'' اجنبی شخص نے پوچھا۔

نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بالکل بھی نہیں۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ اور پھر روتے ہوئے کہنے لگا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سونا مارتھا کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا تو میں کبھی بھی اس چوری کا ارتکاب نہ کرتا۔

''آپ کا نام کیا ہے جناب''

''جوہان میٹر''

''جوہان میٹر'' __ اجنبی نے اپنی ہتھیلی بوڑھے شخص کی اندھی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا'' پھر تو

''آپ لوگوں کی نظر میں معصوم ٹھہرے'' اس لیے جو آپ نے کیا وہ نہ گناہ ہے اور نہ ہی چوری۔ اسے تو ثواب سمجھا جانا چاہیے۔''

''آمین'' بوڑھے شخص نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ثم آمین'' اجنبی شخص نے دُہرایا۔ ''اب آپ اپنی آخری خواہش بتائیں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ کوئی میری بیٹی ماریا کا خیال رکھے۔''

''یہ کام میں کروں گا۔'' اب آپ اور کیا چاہتے ہیں۔''

تو پھر جب قریب المرگ بندہ اچانک مسکرا اُٹھا تو بلند آواز سے کہنے لگا۔

''میں ایک بار پھر اس طرح کی مارتھا کو دیکھنا چاہوں گا جیسی اُن دنوں تھی جب ہم جوانی کے وقت ایک دوسرے کو ملے تھے اور مجھے سورج اور اس پرانے باغ کو موسم بہار میں پھلتا پھولتا ہوا دیکھنے کی آرزو ہے۔ لیکن یہ تو پھر ایک ان ہونی بات ہوئی نا۔

جناب مجھے امید ہے کہ آپ میری ان بے وقوفانہ باتوں کا بُرا نہیں مانیں گے۔ میری بیماری نے یقیناً میری تمام خُدبد کو ختم کر دیا ہوگا۔‘‘
اچھا پھر۔ اجنبی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اُس نے پھر اچھا کہا اور ہارپسی کارڈ کے پاس جا کر سامنے پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔ اُس نے جب تین بار بلند آواز سے کہا تو اچانک سارے ڈھارے میں ایک عجیبی جھنا رسی بکھر گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے سینکڑوں بلوری رنگ کی گیندیں فرش پر گرا دی گئی ہوں۔
سُنیں۔ ’’اجنبی بندے نے کہا۔ سُنیں اور دیکھیں۔
اُس نے اُس ساز کو بجانا شروع کر دیا۔ بعد میں جب اُس کے لمس سے پہلا سُر برآمد ہوا تو ماریا نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو اُس کی پیشانی پر زردی سی پھیل گئی۔ اور اُس کی مزید تاریک ہوتی ہوئی آنکھوں میں موم بتی سی جھلملانے لگی۔
اتنے برسوں کے بعد اس ساز میں سے ایک بھرپور آواز نکلی تھی۔ اس کے سُروں سے نہ صرف کچا کوٹھا بلکہ سارا باغ بھی بھر گیا تھا۔ بوڑھا کتا اپنے کتا خانے سے باہر آ کر ایک جانب کو سر نیہوڑا کر بیٹھ گیا تھا۔ اُس کے کان کھڑے تھے اور وہ آہستہ آہستہ اپنی دُم ہلا رہا تھا۔ گیلی برف گرنے لگی تھی۔ لیکن کتا مسلسل دم ہلائے چلا جا رہا تھا۔
’’مجھے نظر آ رہا ہے جناب‘‘ بوڑھے شخص نے کہا۔ وہ اپنے بستر سے کچھ قدر باہر نکل آیا تھا۔ مجھے وہ دن میری آنکھوں کے سامنے ہے جب میں مارتھا سے ملا تھا۔ وہ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ اُس کے ہاتھ سے دودھ سے بھرا جگ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ سردیوں کا دن تھا۔ پہاڑوں سے نیلے شیشے جیسا خوبصورت آسمان نظر آ رہا تھا۔ اور مارتھا ہنس رہی تھی۔ ’’اس کے کانوں میں مسلسل ہارپسی کارڈ کی تاروں کی سنسناہٹ پڑ رہی تھی۔
اجنبی شخص تاریک کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا سنگیت بکھیرتا رہا۔
’’اور اب‘‘ اُس نے پوچھا۔ کیا آپ تھوڑا بہت دیکھ سکتے ہیں؟‘‘
بوڑھا شخص بڑے دھیان سے اُس کی باتیں سنتا رہا لیکن خاموش رہا۔
’’کیا آپ دیکھ نہیں پا رہے؟‘‘ اجنبی پھر گویا ہوا۔ وہ مسلسل ساز بجاتا رہا۔
رات اب گہرے نیلے رنگ کی ہوگئی تھی لیکن پھر ہلکے نیلے رنگ میں بدل گئی۔ اوپر کہیں سے ننھی روشنی نیچے آ رہی تھی۔ اور آب کے اشجار کی پرانی ٹہنیوں پر سفید پھول کھل اٹھے تھے۔
میرا خیال ہے کہ یہ سیبوں کے پھول ہیں۔ لیکن

یہ یہاں کمرے سے بڑے بڑے گلِ لالہ کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔ دیکھو پتھروں کی اس وادی پر پہلی کرن پڑی ہے، جو اسے ہلکی سی تپش سے دوچار کر رہی ہے۔ جس کی وجہ سے وہاں سے سینک سا اُٹھ رہا ہے۔

یہ یقیناً برف سے بھری کاہی ہو گی جو کہ اب سوکھنے کو ہے۔ آسمان اب بلند سے بلند تر ہوتا دکھائی دے رہا اور اس کا نیلا رنگ اور گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے سے زیادہ روشن اور شاندار بھی۔ پنچھیوں کی ڈاریں بھی ہمارے پرانے دی آنا کے اوپر سے مغرب کی جانب محوِ پرواز ہیں۔

''میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔'' بوڑھا شخص اونچی آواز سے بول پڑا۔ ہارپسی کارڈ کے سروں میں ایک جشن جیسا سما اُمڈ رہا تھا۔ یہ سنگیت صرف اُس کا ہی نہیں تھا۔ یہ تو سینکڑوں نہاں آوازوں کی رچنا تھی۔

''نہیں جناب،'' ماریا اجنبی سے مخاطب ہوئی۔ ''وہ پھول گلِ لالہ جیسے قطعاً نہیں ہیں۔ یہ تو وہ سیبوں کے پیڑ ہیں، جن کی شاخوں پر رات بھر میں پھول کھل چکے ہیں۔''

''ہاں۔'' ___ اجنبی نے جواب دیا۔ یہ سیب ہی کے پیڑ ہیں۔ لیکن ان کے پھولوں کی پتیاں بڑی ہیں۔''

''کھڑکی کھول دے ماریا''۔ بوڑھے آدمی نے کہا۔

ماریا نے کھڑکی کھول دی۔ اور جیسے ہی کھڑکی وا ہوئی تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھاگتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

اجنبی اب ساز کو بڑے دھیمے سروں میں بجا رہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ کمبل کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ماریا جلدی سے اُس کے پاس آئی تو اس نے ساز بجانا بند کر دیا اور وہ اس ساز کے پاس ایسے بیٹھ گیا جیسے وہ اپنے ہی سنگیت سے سحر زدہ ہو گیا ہو۔

ماریا رونے لگی۔ اجنبی اُٹھا اور اپنے بستر کے پاس چلا گیا۔ بوڑھے شخص نے گھٹی گھٹی آواز سے استفسار کیا۔ ''اب مجھے اتنا ہی صاف دکھائی دے رہا ہے جیسا پہلے تھا۔

لیکن اجنبی میں آپ کا نام جانے بغیر مرنا نہیں چاہتا..... آپ کا نام ؟''میرا نام ولفگا گانگ موزارٹ ہے۔'' اجنبی نے جواب دیا۔

ماریا بستر سے پیچھے ہٹ کر تعظیم کے لیے اُس کے آگے جھک گئی اس لیے کہ اُس کے سامنے عالمی شہرت کا مالک سنگیت کار کھڑا تھا۔

جب وہ کھڑی ہوئی تو بوڑھا شخص مر چکا تھا۔ صبح صادق کھڑکی سے باہر جگمگا رہی تھی، جس کی روشنی میں تمام باغ گیلی برف سے اَٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

''قصہ مختصر''

تم نے ہمیشہ اپنی منوائی۔ ساری حیاتی تمھاری مطلق العنان حاکمیت رہی۔ میرا درد کبھی تمھارا درد نہیں رہا۔ تمھارے درد نے میرے وقت کا بڑا حصّہ کھا لیا۔ حسّاسیت روحانیت تمھاری تو سمجھ سے بالاتر ہیں اور رہیں گے تمھارے ساتھ رہنا تو بس ایک دکھاوا ہے۔ تمھاری سمجھ کی دوڑ تُم تک ہی تو ہے تُم اپنے آپ سے آگے دیکھ نہیں سکتے۔ میری جان چھوٹے گی تمھارے قفس سے نکل کر.....

تمھاری سوچ، اپروچ، خواہشات کا سرکل، دوڑ دھوپ کے ڈھنگ الغرض سارے راستے ہی مجھ سے الگ تھے۔ جب کبھی تمھیں اپنی راہ پہ لگانا چاہا میری دلیل تمھیں ماورائے خیال، تخیلاتی اور غیر حقیقی لگی۔

پھر میں نے بھی فیصلہ کرلیا اپنی مصیبتیں آپ بھگتو، اپنے مصائب اپنے احکام سے روک سکتے ہو تو روک لو۔ نہیں روک سکتے تو سمجھوتہ کرو اس کے سوا تم کر ہی کیا سکتے ہو۔

ہاں تم نے مجھے سمجھایا فاصلہ قدموں سے طے ہوتا ہے، بوجھ بازوؤں کے بل بوتے پہ اُٹھایا جاتا ہے، آنکھ دیکھتی ہے کان سنتا ہے یہ سب ایک عمارت کی مانند باہم جُڑے ہوئے ہیں۔

میں نے ناک بھوں چڑھایا خاک جُڑے ہوئے ہیں (یہ تمھاری سائنس ہے) یہ تمھارے دوستوں، بچوں، عزیزوں کی طرح ''نفسی، نفسی'' کی تارو پود سے جُڑے ہوئے ہیں۔ کبھی سوچ کے دیکھو ان کی فرمائشیں ایک دوسرے کے متضاد ہوتی ہیں، کسی کو حرارت مطلوب ہے، تو کسی کو ٹھنڈک، اِن کے معالجین کی الگ الگ دکانیں سجی ہیں۔

ہٹاؤ میاں یہ عمارت والی مثال۔

ایسا نہیں ہے کہ میں نے تُم سے نفرت کی اور شاید تمھاری طرف سے بھی ایسا نہیں ہے۔

اصل میں یہاں لفظ 'نفرت' کہنا غیر موزوں ہے - ہم ایک دوسرے کے چہرے، مُہرے، بول چال، آواز، لہجے، لمس کے اتنے عادی ہو گئے کہ گویا یک جان دو قالب..... نہیں..... یہ درست نہیں..... کہ گویا ایک سکے کے دو رُخ..... ہاں یہ ٹھیک ہے۔ دونوں رُخ کے بغیر سِکہ مکمل نہیں ہوتا مگر دونوں رُخ کی بدقسمتی ملاحظہ ہو وہ کبھی ایک دوسرے کو پرکھ نہیں پاتے دیکھ نہیں پاتے - ہم ایک دوسرے کی پہچان بن جانے کی قید میں پھنس گئے۔

دردانہ نوشین خان

کچھ عجیب نہیں لگتا کہ پرندے کو پنجرے سے، اور پنجرے کو پرندے سے پہچانا جائے؟ پرندہ تو پنجرے سے نکل کر بھی پرندہ رہے گا۔ خالی پنجرہ ردّی کا مال..... دوسری طرف پنجرے سے مانوس تر پرندہ آزاد ہو کر، کچھ حیران، کچھ غیر محفوظ، کچھ خوش، کچھ پُر جوش اور..... خوف زدہ ہو کے آگے بڑھے گا۔ قدم لڑکھڑائیں گے۔ خود کو قوتِ پرواز سے عاری محسوس کرے گا۔ پنجرے کی طلب بھی ہو سکتی ہے مگر پنجرے سے کوئی رسپانس نہ پا کر آخر کار اپنا راستہ تلاش کرے گا..... جب بے کراں وسعتیں دیکھے گا تو شاداب، سرشار اور نہال ہو جائے گا.....

شروع کی چند ساعتوں کے بعد گزشتہ ساتھ کا خیال محو ہو جائے گا۔

چہ جائیکہ ملال ہو، اے پنجرے! اس خوش گمانی کو بھول جا۔

ہاں، تمھارا میرا ساتھ اچھا رہا..... یعنی اچھا بھی رہا۔ میں نے اپنے ہونے کو تمھارے ہونے سے منوایا۔ تم نے کبھی کبھار میری آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے میں تعاون کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے۔ جس طرح اشد محبت ہوتی ہے اسی طرح اشد ضرورت..... خیر تمھیں تو بڑا زعم تھا کہ تمھیں میری ضرورت نہیں۔ دست و بازو، علم و دانش تمھارے تابع ہیں۔ خواہ تمھارے تابعدار کئی بار تمھارے باغی ہوئے۔ پھر یہ تمھارے معاونین بوڑھے ہونے لگے۔ مگر میں بوڑھی نہیں ہوں۔ میں سدا بہار تر و تازہ اور جوان ہوں۔ تمھارے ضعیف وجود کے ساتھ مجھے بُزرگانہ اطوار اپنانے پڑے۔ برستی بارش کی ٹھنڈی بوندوں میں جھومنا لہرانا پہاڑوں کے فراز راستوں پر بھاگتے ہوئے چڑھ جانا، حُسن کی مصوّری سے مسحور کرنا، شوخیاں، خوشیاں، آزادیاں میری دنیا تھی۔ ہونا میرے لیے ایک مزہ تھا۔ سالوں کی تعداد کا مجھ سے کیا لینا دینا، مجھے کیونکر شمسی قمری سالوں کو یاد رکھنے کی ضرورت، یہ سرائے کے مسافروں کے خود ساختہ نقلی ناپ، تول، گزشتہ موجودہ آئندہ کے پیمانے میری دنیا نہ تھی، بنا دی گئی۔

تو سیدھا سیدھا مان لو میں تم سے برتر ہوں اور آفرین دو مجھے کہ تمھارے ساتھ گزارہ کرتی رہی۔

بس کرو، تمھاری وہی ''اگر..... مگر، لیکن'' کی عادت اس بدصورت بڑھاپے تک نہ گئی۔ بُرا مان گئے؟ بدصورت بڑھاپا کہنا اچھا نہیں لگا؟ آئینہ زیادہ دور تو نہیں ہے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔

ڈیئر! مجھے آواز مت دوں۔ وہ عمارت کی توانائی و اتحاد کیا ہوا؟ حکم دو عمارت کو..... پانی کا گلاس تمھیں پکڑا دے مجھے منتِ آمیز نگاہ سے مت دیکھو۔ کسی پیار بھری آس کی توقع بے معنی ہے۔

ایک دوسرے سے وابستہ ہماری پہچان کا بھرم ٹوٹ گیا ہم اپنی اپنی اوقات میں لوٹ رہے ہیں۔ تمھیں خاک کی طرف مجھے آفاق کی طرف لوٹنا ہے۔ سارے قصے کا قصہ مختصر یہ ہے۔

ہم یاد تو آئیں گے لیکن لوٹ کے نہیں۔

☆☆☆☆☆

گھر

کہتے ہیں جب گفتگو میں لمبے لمبے وقفے آنے لگیں تو سمجھیں یا تو آپ کے پاس باتیں ختم ہو گئیں ہیں اور آپ کے درمیان کہنے کو کچھ نہیں رہا یا پھر تعلق کا اختتام ہوا چاہتا ہے- یا پھر آپ ایک دوسرے کو بوجھ محسوس کرنے لگتے ہیں- لہٰذا اس کا بہترین حل تو صرف ایک دوسرے سے چھٹکارا ہی ہے مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھٹکارا پالینا اتنا آسان نہیں ہوتا- کوئی ایک فریق تعلق اور محبت کی صلیب پر لٹکا ہی رہتا ہے مگر دوسرا شخص شاید کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہوتا ہے یا اُس نے اپنی کوئی اور مصروفیت ڈھونڈ لی ہوتی ہے یا پھر کچھ اور-

سمعیہ اور سُنان بھی سہمے ہوئے سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے -ایک بیزاری دونوں کے وجود پر چھائی رہتی -زندگی کہیں ٹھہر سی گئی تھی، جیسے چلتے چلتے راستہ بھول گئی ہو- یہ راستہ دونوں کے گھر کے اندر کہیں گم ہوا تھا- کیسے گم ہوا تھا- دونوں ہی نہیں جانتے تھے-وہ ازسرِ نو تعلق اُستوار کرنے اور بات کا سرا ڈھونڈنے میں لگے رہتے-

اس میں زیادہ کوشش سُنان کی ہی ہوتی-وہ نہیں چاہتا تھا کہ محبت کا یہ بے لوث اور پُر بہار تعلق یوں بے اعتنائی اور بے زاری پر ختم ہو جائے مگر ان کے تعلق میں در آنے والی سرد پانی کی جھیل اُنھیں منجمد کرتی جاتی تھی- آنکھیں کسی نا معلوم دیوار پر ٹکی کوئی تصویر بنانے کی کوشش کرتی رہتیں- زندگی رینگ رہی تھی - سمعیہ کو کبھی کبھی اتنی سفوکیشن محسوس ہوتی کہ وہ فوراً سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی بیک یارڈ کے گھنے جنگلوں میں گم ہو جاتی- بلا وجہ ہی کھرپا پکڑ کر کیاریاں درست کرنے لگتی- سوکھے پتے اکٹھے کرتی- اُنہیں جلا کر گھنٹوں دھوئے کے مرغولے دیکھتی رہتی- اپنی زندگی کو دھوئیں کے ان کالے اور سفید مرغولوں کی مثال سمجھتی-

آسناتھ کنول

میں بھی تو دھوئیں کی مانند اُڑتی جاتی ہوں۔ وہ ڈپریشن میں چلی جاتی۔ اس محبت نے مجھے آخر کیا دیا ہے۔ اک بے وفا کا ساتھ۔ مکار آدمی۔ اکثر سُنان اُسے ڈھونڈتا ہوا بیک یارڈ میں چلا آتا۔ تو وہ مٹی اور دُھول میں اَٹی ہوئی کسی آرام کرسی میں دھنسی ملتی۔ اس کی حسین شربتی آنکھیں گدلے پانیوں سے بھری ہوتیں۔ سُنان اس کے بال سنوارتا، اُس کے کپڑے جھاڑتا۔ جو جھاڑ اور جھنکار سے بھرے ہوتے۔ اُس کی چپل صاف کر کے اُسے پہناتا۔ اپنے مضبوط بازوؤں میں اس کے نازک سے وجود کو سمیٹتا اور اُوپر گھر میں لے آتا۔ سمعیہ! سمعیہ! سُنو۔ وہ سُنی ان سُنی کر دیتی۔ میری بات سُنو۔ وہ التجائیہ انداز میں پکارتا۔ وہ اپنی لانبی، گھنی پلکیں اُٹھا کر اُسے دیکھتی۔ ان آنکھوں کی شربتی بہاریں کہاں رخصت ہو گئیں۔ یہاں تو صرف دشت و صحرا ہیں۔ جن کی ویرانی سے ڈر لگتا ہے۔ سمعیہ! مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟ بخدا میں وہی کروں گا۔ جو تم چاہو گی۔ تم اس طرح کہاں گم ہو جاتی ہو؟ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ میں بہت اکیلا ہو گیا ہوں۔ مجھ سے یہ بے رُخی کیوں؟ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ وہ چیخ پڑتی۔ اس کے چہرے کی وحشت سُنان کا دل توڑ دیتی۔ تم کہیں چلے جاؤ۔ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ بس وہ حکم جاری کرتی۔ مجھے میرا قصور تو بتا دو۔ میں تمہیں سنبھالنا چاہتا ہوں۔ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

میں جانتی ہوں۔ یہ صرف تمہارا بہانہ ہے۔ تم نے دراصل مجھ سے محبت کبھی کی ہی نہیں تھی۔ وہ زور زور سے بولنے لگی۔ تم میرے تھے ہی نہیں۔ تم ایک بے وفا ہو۔ مجھ سے جھوٹ بولتے رہے۔ تم محبت کو کیا جانو۔ وہ ہانپ گئی۔ چہرے پر سلوٹیں گہری ہوتی گئیں۔ آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔ خود کو سنبھالو میری جان۔ سُنان سراپا التجا تھا۔ چلے جاؤ بس چلے جاؤ۔ بولتے بولتے سمعیہ کا گلا رندھ گیا۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ او۔ کے۔ میں چلا جاتا ہوں۔ تم سے دور چلا جاتا ہوں۔ ہم کبھی بات نہیں کریں گے۔ بس ایک شرط۔ وہ کیا! وہ اپنے نازک سے بدن کی پوری توانائی کے ساتھ چیخی۔ تم اپنا خیال رکھو گی۔ زندگی میں ہم کبھی ملے تو تم پہلے جیسی نظر آؤ۔ تم چلے جاؤ۔ مجھے تمہیں دوبارہ نہیں دیکھنا۔ وہ صوفے پر گر پڑی۔ خشک آنکھوں سے ندیاں جاری ہو چکی تھیں۔ سُنان سمجھ چکا تھا کہ ان کا ساتھ اب ممکن نہیں۔ وہ سر جھکائے چُپ چاپ بیڈ روم میں آ گیا۔ سمعیہ کی والدہ کو فون کیا۔ ماما مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم مل گیا ہے۔ اس پر پھر وحشت کا دورہ پڑا ہے۔ آپ آ جائیے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ وہ نارمل ہو جائے تو مجھے بتائیے گا۔ اُس نے بیگ نکالا۔ چند سوٹ ڈالے۔ اپنی پسند کی چیزیں اکٹھی کیں اور شہر چلا آیا۔ جہاں دو کمروں کا اس کا فلیٹ موجود تھا۔ اس نے بزنس بھی وہیں سیٹ کیا اور

مصروف رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر سمعیہ کا دھیان اُس کے ہر کام پر حاوی ہو جاتا۔ خوبصورت پہاڑی علاقے کے ندی کنارے سمعیہ لاج میں سمعیہ اکیلی ہے وہ سوچتا رہتا۔ اس نے تعلق بچانے کی کوشش تو کی تھی مگر سمعیہ جو ایک نہایت شاندار پرسنیلٹی اور سلجھی ہوئی طبیعت والی نرم خو لڑکی ہوا کرتی تھی۔ اس کی وحشت کی وجہ کیا تھی؟ اُس نے کھوج لگانے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے سمعیہ کی والدہ سے کہہ کر ایک ملازمہ کا بندوبست کیا۔ جو ہر وقت اُس کی دیکھ بھال کرتی اور دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ یہ بھی کھوج کرتی تھی کہ آخر سمعیہ کا دُکھ کیا ہے؟ اور سنان سے نفرت کی وجہ کیا ہے؟ وہ یہ سب اُس کی بھلائی کے لیے کر رہا تھا۔ آخر کو وہ اس کی محبت تھی۔ وہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن وہ آفس میں داخل ہوا تو ایک خاتون اچانک ہی اس سے ٹکرائی۔ اُس نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اُسے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ وہ کافی دیر ذہن پر زور ڈالتا رہا۔ کون ہے یہ۔ آپ کون؟ لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ میں ستارا مجید آپ کے قریبی انکل مجید کی بیٹی۔ آپ کی بھابی۔ آپ کے بھائی کی موت کے بعد کچھ عرصہ خاندانی دباؤ کی وجہ سے آپ کی منکوحہ بھی رہی۔ مگر آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہو سکی۔ یوں آپ نے طلاق دے دی۔ میں آپ کے بچے کی ماں بھی ہوں۔

کیا! وہ چونک گیا۔ وہ حیران کھڑا تھا۔ یہ سب کچھ کب ہوا؟ میں تو بھول چکا ہوں۔ جی آپ کو اپنی ایک پرانی کلاس فیلو سمعیہ سے محبت تھی۔ آپ اُسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے طلاق دے کر آپ نے اُسے اپنا لیا اور میں اپنے بھائی کے پاس دبئی چلی گئی۔ وہاں شادی کر لی مگر آپ کا بچہ اس دنیا میں آ چکا تھا۔ مہر سنان۔ کاغذوں میں بھی نام ہے۔ ایک مرتبہ دبئی میں آپ کو اور سمعیہ کو دیکھا۔ دبئی بیچ پر سمعیہ سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام مہر سنان بتایا۔ اس کے باپ کا نام سنان ہے کیا۔ اس نے کنفرم کیا۔ جی سنان مظہر فرام پاکستان۔ مگر ہماری طلاق ہو چکی ہے۔

سنان کو سب یاد آتا چلا گیا۔ تو سمعیہ سب کچھ جان چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا گھر برباد کرنے والی یہ عورت ہے۔ جو بقول اس کے اس کے بچے کی ماں ہے۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے آپ کو ڈھونڈا ہے۔ میں آپ کا بچہ واپس کرنا چاہتی ہوں۔ میرا شوہر اب اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔ آپ اُسے اپنا لیجیے۔ ورنہ وہ کسی یتیم خانے میں پلتا رہے گا۔ اس عورت کی آنکھوں میں سفاکی غصہ اور انتقام تھا۔ چلو آفس میں بیٹھو اس پر بات کرتے ہیں۔ وہ یکدم نرم پڑ گیا۔ اس نئی سچویشن کو ہینڈل کرنا مشکل تھا۔ وہ کسی نئی مصیبت میں پڑ گیا تھا اور سمعیہ نے کبھی بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہی اپنی جان پر

اتنا بڑا بوجھ لے کر جیتی رہی۔ دُکھ سہتی رہی۔ حتیٰ کہ بیمار ہوگئی۔ شدید ڈپریشن میں چلی گئی۔ یا میرے خدایہ کیا ہوا تھا۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ سمعیہ تو پہلے ہی مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ ایسے میں بچے کے ساتھ۔ وہ تو مر ہی جائے گی۔

سوچ سوچ کر دماغ کی رگیں دکھنے لگیں۔ پھر ایک فیصلہ کر کے وہ اندر آیا۔ جی محترمہ۔ اب فرمایئے۔ میں ستارا حمید ہوں آپ کی سابقہ بیوی۔ خیر اس بات کو دھرانے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے ذرا سختی سے کہا۔ ٹھیک ہے آپ بچہ میرے حوالے کر دیجیے۔ آپ کا شکریہ آپ نے اس کی پرورش کی مگر میں چاہوں گا کہ آئندہ آپ کبھی دوبارہ مجھ سے نہ ملیں اور نہ بچے سے ملنے آئیں۔ آپ جتنا میری زندگی کو تباہ کر سکتیں تھیں کر چکی ہیں۔ میری اور سمعیہ کی علیحدگی ہو چکی ہے۔ صرف آپ سے ایک غلط قسم کی ملاقات سے۔ لہٰذا مزید دکھ دینے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ آپ کا بدلہ پورا ہو چکا ہے۔ ستارا نے چالاک نظروں سے اُسے دیکھا۔ میرے اخراجات مجھے دیجیے جو بچے کو پیدا کرنے اور پالنے پر ہوئے۔ دوں گا۔ اگر یہ واقعی میرا بچہ ہوا تو آپ کو اس عرصے کے سارے اخراجات ادا کر دوں گا۔ ستارا مجید تھوڑا سا گھبرائی۔ پھر سنبھل گئی اور اعتماد سے بولی۔ ٹھیک ہے۔ اگلے ایک ہفتے میں ڈی این اے ٹیسٹ ہو گیا۔ بچہ واقعی سُنان اور ستارا مجید کا ہی تھا۔

سُنان نے بھاری رقم کا ایک چیک ستارا مجید کو پیش کیا اور اُسے ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ وہ خود سوچوں کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ بچے کے لیے اُس نے آیا کا بندوبست کیا۔ جو بچے کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ مہر کی شکل و صورت باپ جیسی ہی تھی۔ سُنان کو اُس سے پیار ہونے لگا۔ وہ بہت سا وقت اُس کے ساتھ گزارتا۔ اُسے باہر گھمانے لے جاتا۔ اب وہ کافی خوش بھی تھا۔ بچہ جس کے لئے وہ کافی سالوں سے ترس رہا تھا۔ اچانک مل گیا تھا۔ اُس کا بچہ۔ جس کے بارے میں اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یکدم وہ جیسے مالا مال ہو گیا تھا۔

ایک دن ایک منصوبے کے تحت اُس نے سمعیہ کی والدہ کو فون کیا۔ آنٹی کو اعتماد میں لے کر وہ یہ نیا پلان آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اُس نے ساری صورت حال آنٹی کو بتا دی۔ اتنی بڑی بات کو کب تک چھپایا جا سکتا تھا۔ آنٹی جیسے پتھر کی ہو گئیں۔ یہ اچانک کیا ہوا تھا۔ کیسا کرشمہ تھا۔ وہ اس نئی افتاد کے بارے سوچنے لگیں۔ ان کا دل دہل کر رہ گیا۔ سمعیہ کے ری ایکشن سے ڈرتی تھیں۔ اکلوتی بیٹی پہلے ہی زخم خوردہ تھی۔ اب تو بات ہی بدل گئی تھی۔ سُنان کو بچہ بھی مل گیا تھا۔ سُنان نے کس نئی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ کتنے دن اس بات پر غور کرتی رہیں۔ سُنان کی بات بھی معقول تھی۔ سمعیہ کی اب تک اولاد بھی نہیں ہوئی تھی اور

آئندہ اُمید بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر اُسے جواب دے چکے تھے۔ ایسے میں اگر ایک بچہ اس کی زندگی میں آجائے تو صورت حال اس سے بہت بہتر ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ وہ قبول کرلے۔ مجھے اس سے بات تو کرنی ہوگی۔ باقی اُس کا فیصلہ۔ ماں نے لفظ ڈھونڈنے شروع کیے۔ کتنے ہی دن وہ اپنے لفظوں کا چناؤ کرتی رہیں۔ جو کم سے کم تکلیف دہ ہوں۔ وہ سمعیہ کے ردعمل سے خوف زدہ تھیں۔

پھر ایک دن اُجلی دھوپ میں ٹیرس پر بیٹھے ہوئے سمعیہ کا موڈ بہت اچھا تھا۔ صبح کی ہلکی سی خنکی ابھی تک برقرار تھی۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل اچھا لگ رہا تھا۔ بادلوں کی سفید ٹکڑیاں نیلے آسمان میں پھولوں کی مانند تھیں۔ جیسے نیلے کنول ہوں۔ ماما۔ آج دن کتنا اچھا ہے! ہاں۔ وہ تو ہے۔ ماما کافی کا مگ رکھتے ہوئے بولیں۔ دن تو اچھا ہے۔ میں چاہتی ہوں ہر دن تمہارے لیے بہت اچھا ہو۔ اک حزن آمیز مسکراہٹ سمعیہ کے چہرے پر بکھری۔ آنکھوں کے گرد حلقے گہرے ہوتے جاتے تھے۔ سنہری رنگت سنولا گئی تھی۔ ماں نے غور سے اُس کا چہرہ دیکھا۔ وہ دُکھ کی اتھاہ میں اُتر گئیں۔ فارن ریٹرن۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹی یوں اپنا آپ چھوڑ بیٹھی تھی۔ تم سنان کے بزنس میں شامل تھیں۔ پھر کیوں چھوڑ دیا۔ ماما نے سوال کیا تو سمعیہ کے چہرے پر کتنے ہی رنگ آکر گزر گئے۔ آنکھ میں دُکھ کا بادل اُترا۔ اس سے پہلے کہ وہ برستا۔ ماما نے بات بدل دی۔

ویسے سمعیہ ہم اگر ایک بچہ گود لے لیں تو کتنی رونق ہو جائے گی اور سمعیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مروڑ دیا ہو۔ ماں نہ بن سکنے کی اذیت اس کے چہرے پر درد بن کر بکھر گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دو آنسو دامن بھگو گئے۔ سمعیہ دُکھی تھی مگر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے بچے کی بات اور ہوتی ہے۔ اُس کا گلا واضح طور پر رندھا ہوا تھا۔ سنان کا بچہ بھی تو تمہارا ہی ہے۔ یکدم ہی یہ جملہ ان کی زبان سے پھسل گیا۔ سنان کا بچہ! اُس نے کپ سامنے دیوار سے دے مارا۔ سنان نے میری زندگی اُجاڑ دی۔ وہ ایک بچے کا باپ تھا اور اُس نے مجھے بتایا نہیں تھا۔ میں ساری زندگی بچے کو ترستی رہی اور وہ باپ بن کر بیٹھا رہا۔ بے وفا کہیں کا۔ وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔ میں اُسے جان سے مار دوں گی۔ ماں نے جلدی سے سمعیہ کو پکڑا۔ میری جان تم جتنا مرضی غصہ کرلو۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ کیا حقیقت ہے۔ وہ دھاڑی۔ اُس کی سابقہ بیوی اور بچے سے مل چکی ہوں دبئی میں۔ وہ اُس کا بچہ واپس کر گئی ہے۔ ماں نے اک اور نشتر لگایا۔ وہ چاہتی تھی اس رستے ناسور کا سارا گندہ مواد ایک ہی دفعہ باہر نکل جائے۔ روز سسکتے رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کیا؟ سمعیہ نے ماں کے کندھے جھنجھوڑ ڈالے۔ وہ بچے کو واپس کر گئی! کم ظرف عورت۔ کیسی ماں تھی؟ وہ دکھی ہوگئی۔ ہاں اور وہ بچے کی

بھاری قیمت وصول کر کے گئی ہے سُنان سے۔ ماں نے بتایا۔ اُس نے پیسے لیے ہیں اُس کے! سمعیہ حیرتوں میں غوطہ زن تھی۔ بے غیرت عورت ہے۔ سمعیہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ کیا کہے۔

سُنان کا اُس سے رابطہ تھا ناں۔ ہے نہ ماما۔ نہیں نہیں۔ ماں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ خود ہی ڈھونڈتی ہوئی پہنچ گئی تھی۔ اب وہ اپنے شوہر اور بچوں کے پاس واپس جا چکی ہے۔ بچہ سُنان کے پاس ہے۔ اس نے اپنا اور بچے کا ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر بچہ واپس لیا ہے۔ اچھا! اب کہ سمعیہ کا ردعمل کافی شانت اور پُرسکون تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر کھڑکی سے باہر شاہ بلوط کے درختوں کو دیکھتی رہی۔ خنک ہوا کے جھونکے دماغ کو تازگی دے رہے تھے۔ ماں کچھ سوچتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔ کاری وار گزر چکا تھا۔ زخم پھٹ جانے کی اذیت سمعیہ کے وجود پر طاری رہی۔ سُرخ آنکھوں میں اشکوں کی برسات رِم جھم رِم جھم بن کر برسی تو اُس نے خود کو آنسوؤں کے سپرد کر دیا۔ ماں کھڑکی سے کبھی کبھی جھانک لیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ سمعیہ کوئی واضح فیصلہ کر لے۔

وہ اُسے بے تحاشا روتے دیکھ کر دُکھی بھی تھیں مگر اُسے چُپ بھی نہیں کروانا چاہتی تھیں۔ کتنے سالوں کا غبار آج اگر دُھل جائے تو شاید حالات بہتر ہو جائیں۔ کافی دیر ٹیرس پر ٹہلنے کے بعد وہ اندر آئیں۔ اُن کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔ سمعیہ بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ سُندر سی گالوں پر ابھی بھی موتی چمک رہے تھے۔ پلکیں ستاروں سے روشن تھیں۔ سمعیہ بیٹے۔ سمعیہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ شربتی جھیلوں میں کتنا کچھ ڈوب گیا تھا۔ یہ جوس پیو۔ اُس نے جوس لے لیا۔ ماما۔ جی میری جان۔ ماں نے بلائیں لیں۔ سُنان سے کہو ہمارے بچے کو لے آئے۔ وہ بن ماں کا بچہ نہیں ہے۔ آنسو اب بھی تواتر سے گر رہے تھے۔ اب وہ پُرسکون تھی۔ میں نے بچے کی خاطر سُنان کو معاف کر دیا ہے۔ بلآخر وہ سُنان کا بچہ ہے۔ میری جان۔ ماں نے بیٹی کے بال سنوارے اور ماتھا چوم لیا۔ اب کے اُسکی مسکراہٹ بڑی شفاف تھی۔ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔ جانتی ہوناں۔ سُنان صرف تم سے محبت کرتا ہے۔

ماں نے ساری داستان اُس کے گوش گزار کی۔ سُنان کی مجبوری اُسے بتائی۔ وہ چُپ چاپ سب کچھ سنتی رہی۔ سمعیہ اُٹھی۔ اُس نے بچے کے لئے خود کمرہ سجایا اور اُس کے استقبال کی تیاری کرنے لگی۔ ابھی شام پوری نہیں اُتری تھی جب سُنان ایک خوبصورت سے گول مٹول بچے کو اُس کی گود میں ڈال رہا تھا۔ سمعیہ کا دل مامتا سے بھر گیا۔ آج اُس کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

گم شدہ

کہیں دور سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ڈھول پیٹ رہا ہو۔ ''نہیں شاید یہ ڈھول نہیں ہے، کچھ اور ہے۔'' اس نے غنودگی کے عالم میں سوچا۔ اگر یہ ڈھول نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ شاید کوئی لوہار لوہا کوٹ رہا ہے۔ نہیں یہ لوہار بھی نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔ آواز میں شدت آ گئی۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ اب وہ مکمل طور پر بیدار ہو چکا تھا۔ کوئی زور زور سے اس کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کچھ دھندلا نظر آ رہا تھا، اس نے آنکھیں مل کر دیکھا نو بج رہے تھے۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک دی گئی۔

''آتا ہوں، ذرا صبر تو کرو۔'' اس نے بستر سے اُٹھتے ہوئے زور سے کہا۔ اچانک اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی۔ وہ بُری چونکا اور دروازے کی طرف بڑھتے قدم رُک گئے۔ آئینے میں اسے ایک نامانوس شخص نظر آیا تھا۔ دروازے کی طرف بڑھنے کے بجائے وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھا اور عکس کو غور سے دیکھنے لگا۔ دکھائی دینے والا شخص ستر برس کا رہا ہوگا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ سر کے بال کافی حد تک اُڑ چکے تھے۔ بچے کھچے بال برف کی مانند سفید تھے۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔ یہ شخص کون ہے؟ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کی پشت پر رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے دروازہ کھولنے کا ارادہ موقوف کر دیا۔ ایک بار پھر کسی نے دستک دی۔ ''دروازہ کھولو'' کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

''تھوڑی دیر انتظار کرو۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ زور سے بولنے کی وجہ سے اسے کھانسی آ گئی۔ اس دوران باہر سے کچھ کہا گیا۔ ''میں نے کہا ناں تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولتا ہوں۔'' اس نے کھانسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

وسیم جیران

''آخر آپ کر کیا رہے ہیں؟'' باہر سے پوچھا گیا۔

''بتاتا ہوں، کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔'' وہ صورت حال پر غور کرنا چاہتا تھا۔ وہ گزری ہوئی رات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ گھمائیں۔ دیوار پر لگی تصویر دیکھ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ یہ فیملی فوٹو تھی۔ یہ تصویر اس نے چند ماہ پہلے ہی بنوائی تھی۔ صوفے پر وہ اور اس کی بیوی درمیان میں بیٹھے تھے اور دائیں بائیں اس کی بیٹی اور بیٹا تھا۔ اسے یاد آیا کہ یہ اس کی بیوی کی خواہش تھی کہ ان کے بیڈ روم میں فیملی فوٹو ہو اور تصویر بنوانے کے لیے وہ ایک اسٹوڈیو میں گئے تھے۔ تصویر میں تیس برس کا جوان آدمی تھا جس کے سر پر گھنے سیاہ بال تھے۔ جسم فربہی مائل تھا۔ اس کے بائیں جانب متناسب جسم والی اس کی خوب صورت بیوی تھی۔ دائیں جانب اس کی چار سالہ گول مٹول بیٹی تھی اور بیوی کے ساتھ اس کا سات برس کا دبلا پتلا بیٹا بیٹھا تھا۔

اس نے گزشتہ چند روز اور خاص طور پر گزری ہوئی رات کے بارے میں سوچا۔ وہ ایک دفتر میں کلرک کے طور پر کام کرتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کا سخت گیر باس ان دنوں بہت زیادہ کام دے رہا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی کلرک، ہیڈ کلرک کے دفتر میں بیٹھ کر باس کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ باس کو چند مہینے پہلے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس کی انجیو گرافی ہوئی تھی اور چند دن بعد ہی وہ صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تھا۔ ہارٹ اٹیک نے باس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا وہ اسی تند مزاجی کے ساتھ ان سے کام لیتا تھا۔ کام بہت زیادہ تھا اور تنخواہیں بہت کم تھیں۔ مشکل یہ بھی تھی کہ پرائیویٹ ادارہ تھا۔ گورنمنٹ جب تنخواہ بڑھاتی تھی تو ادارہ ان کی تنخواہ نہیں بڑھاتا تھا۔ انھوں نے کئی بار باس سے بات کی تھی لیکن باس کے پاس ہزار دلائل ہوتے تھے کہ تنخواہ کیوں نہیں بڑھائی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر بار ایسی درخواست کے بعد سختی کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔

اسے یاد آیا کہ گزشتہ روز دفتر میں کام کے دوران باس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ باس کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ شام کو پانچ بجے دفتر سے چھٹی کے بعد اس کے ساتھی کلرک نے کہا تھا کہ باس کی عیادت کے لیے جاتے ہیں مگر اس کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ اس نے منع کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ جس ہسپتال میں باس کا علاج ہو رہا تھا وہ اس کے گھر سے خاصا دور پڑتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کل چلے جائیں گے آج گئے تو بیٹی کی سالگرہ کا پروگرام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نے اپنی بیوی بچوں سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ دفتر سے واپسی پر وہ کیک لے کر گھر آئے گا۔ اس نے اس پارٹی

میں اپنے پڑوسی اور دوست مرزا صاحب کی فیملی کو بھی بلایا ہوا تھا۔ وہ سب گھر میں اس کے منتظر ہوں گے۔ لیکن اس کا ساتھی کلرک نہیں مانا تھا۔ اصرار کر کے اسے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ کیک لے کر تین گھنٹے کی تاخیر سے گھر پہنچا تھا۔ اس نے بچوں اور مرزا صاحب کو تو منا لیا تھا لیکن بیوی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ ان کے درمیان خاصی تو تو میں میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ سو گیا تھا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صبح اٹھتے ہی یہ افتاد آن پڑے گی۔ گزشتہ روز پیر تھا، دفتر کا پہلا دن تھا۔ یہ یاد آتے ہی وہ اچھل پڑا۔ اف آج منگل ہے اور دفتر پہنچنے کا وقت صبح آٹھ بجے ہے جب کہ اس وقت سوا نو بج رہے تھے۔ لیٹ جانے کی صورت میں اس کی ایک دن کی تنخواہ کٹ سکتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر آئینے میں دیکھا۔ اس پر عجیب سی جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ میں کیسے دفتر جا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ یہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ میرا جسم کدھر ہے؟ دروازے پر پھر دستک دی گئی۔

''خدارا دروازہ تو کھولیں، آپ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے۔'' اس کی بیوی کی آواز سنائی دی۔

''کھول دوں گا بس تھوڑا سا وقت اور دے دو۔''

''آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں تم فکر نہ کرو۔'' اس نے آواز لگائی پھر آئینے میں دیکھ کر آہ بھری۔ میں کہاں ٹھیک ہوں۔ میرا جسم گم ہو گیا ہے۔ میں باہر نکلوں گا تو میری بیوی مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ میرے بچے بھی مجھے نہیں پہچانیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ ڈر جائیں۔ میں انہیں کیا بتاؤں گا کہ میرا جسم کہاں ہے؟ میری بیوی میری بات سننے کے بجائے شاید پولیس کو بلا لے گی۔ میرے خلاف رپورٹ درج کروائے گی کہ میں نے اس کے خاوند کو کہیں غائب کر دیا ہے اور اس کے گھر میں گھس آیا ہوں۔

اس نے سوچا کہ باقی باتیں بعد میں ہو سکتی ہیں پہلے دفتر میں فون کر دینا چاہیے کہ میری طبیعت خراب ہے اور میں آج دفتر نہیں آ سکتا لیکن فون کیسے کروں۔ گھر میں لینڈ لائن تو ہے مگر فون لاؤنج میں ہے۔ لاؤنج میں جانے کے لیے بیڈ روم کا دروازہ کھولنا ہو گا اور دروازے کے باہر اس کی بیوی ہوگی۔ وہ فون بھی نہیں لگوانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ فالتو خرچ تھا لیکن باس کا آرڈر تھا کہ فون لازمی ہے تاکہ وہ کسی بھی وقت کام کے لیے بلا سکے۔ کئی بار اسے چھٹی کے روز بھی بلا لیا جاتا تھا مگر ایکسٹرا ٹائم کے پیسے شاذ و نادر ہی ملتے تھے۔

وہ آئینے کے قریب چلا گیا اور نہایت غور سے اس اجنبی جسم کو دیکھنے لگا۔ وہ اس بوڑھے جسم کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ خاص طور پر وہ چہرہ دیکھ رہا تھا لیکن زیادہ دیر تک

دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ اچانک اسے خیال آیا کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اس نے اُبھری ہوئی رگوں والے بوڑھے ہاتھ کی طرف دیکھا اور جسم پر چٹکی بھری مگر کچھ بھی نہ بدلا۔ دو تین بار چٹکی بھری کچھ بھی نہ ہوا۔ اُف اب کیا کروں۔ اگر یہ خواب ہے تو میری آنکھ کیوں نہیں کھل رہی۔ کاش اب یہ خواب ختم ہو جائے اور مجھے میرا جسم واپس مل جائے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں چلتے ہوئے پیچھے ہٹا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ ''اے رب کریم یہ کن گناہوں کی سزا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

کئی لمحوں تک وہ ساکت بیٹھا رہا۔ دروازے پر ایک بار پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی جیسے کسی نتیجے تک پہنچ گیا ہو پھر اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔

''سنو! کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟''

''جی سن رہی ہوں۔ خدا کے لیے بتایئے کہ کیا مسئلہ ہے؟'' اس کی بیوی کی آواز سنائی دی۔

''میں ایک بہت عجیب مشکل میں پھنس گیا ہوں۔''

''خدا خیر کرے۔ کیا ہوا ہے جلدی بتایئے۔'' اس کی بیوی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''میں۔ مم۔ میرا جسم کھو گیا ہے۔'' اس نے ہکلا کر کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری روح کسی اور جسم میں ہے اور میرا جسم دکھائی نہیں دے رہا۔''

''آپ فوراً دروازہ کھولیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے دیکھ کر تم اور ڈر جاؤ گی۔ پہلے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہا تم کیسے پہچانو گی۔ دیکھو مسئلہ یہ ہے کہ میرا جسم گم ہو گیا ہے اور میں اسے کیسے تلاش کروں۔''

''آپ پتا نہیں کیا کہہ رہے ہیں اگر کچھ گم ہو گیا ہے تو ہم پولیس میں رپورٹ درج کروا دیتے ہیں وہ ڈھونڈ لیں گے۔''

''تم واقعی کچھ نہیں سمجھ رہی ہو۔ کوئی چھوٹی موٹی چیز گم نہیں ہوئی میرا جسم گم ہو گیا ہے۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا بس آپ دروازہ کھول دیں۔''

''میں نہیں کھول سکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس بار اس کی بیوی نے دروازہ کھولنے کے لیے فریاد نہ کی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر اس کی بیوی کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

''تم رو رہی ہو؟'' اس نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''آپ سن نہیں رہے۔ ہاں میں رو رہی

ہوں۔" اس کی بیوی کی رندھی ہوئی آواز آئی۔
"اچھا میں دروازہ کھولتا ہوں لیکن بچوں کو کچھ نہ بتانا۔ بچے کہیں تمہارے آس پاس تو نہیں ہیں۔"
"نہیں میں اکیلی ہوں آپ دروازہ کھولیں" اس نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑا پھر آہستگی سے لاک کھول دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ اس نے ہینڈل پکڑ کر دروازہ اندر کی طرف کھولا۔ اس کی بیوی یکدم اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس وقت شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔ یکدم اسے احساس ہوا کہ اس سے لپٹی ہوئی عورت اس کی بیوی نہیں ہے۔ وہ چونک اٹھا۔ اس نے فوراً اس عورت کو پیچھے ہٹایا۔ دبلی پتلی سی عورت کے بال سفید تھے وہ عمر رسیدہ عورت اس کی بیوی کیسے ہو سکتی تھی۔
"کون ہو تم؟"
"اب آپ مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر رہے ہیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔" بوڑھی عورت نے شکایتی انداز میں کہا۔
"نہیں میں اپنی بیوی کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میرے بچے کہاں ہیں؟" اس نے تیزی سے کہا۔ ایک بار پھر اسے کھانسی آ گئی۔
"آپ کا بیٹا دفتر گیا ہے۔ آپ کی جگہ اب وہی تو کام کر رہا ہے اور آپ کی بیٹی اپنے میاں کے ساتھ اپنے گھر میں ہے۔"
"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میرا بیٹا تو سکول میں ہوگا مگر بیٹی کہاں ہے؟"
"اچھا آپ بیٹھ جائیں۔" بوڑھی عورت اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے لاؤنج میں لے آئی پھر پرانے سے صوفے پر اسے بٹھا دیا۔ پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا۔
"پانی پئیں" اس نے چپ چاپ گلاس پکڑ لیا۔ بوڑھی عورت نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور آہستہ آواز میں باتیں کرنے لگیں لیکن وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔
"بیٹا آج جلدی گھر آ جانا۔ تمہارے ابو بہت بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے انھوں نے ساری زندگی بہت محنت کی ہے کبھی ایک لمحہ آرام نہیں کیا۔ ہمارے ساتھ بھی وقت نہیں گزارا۔ میرا دل چاہتا ہے شام کو ہم کسی پارک میں جائیں اور باہر سے کچھ کھائیں۔ اتنے پیسے ہوں گے ناں تمہارے پاس۔ ٹھیک ہے بیٹا جلدی آنا۔"
وہ سوچنے لگا کہ یہ بوڑھی عورت مدد کے لیے اپنے بیٹے کو بلا رہی ہے اور مجھے بے وقوف بنانے کے لیے کہانی گھڑ رہی ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میری فیملی کدھر ہے؟ اور میرا جسم کہاں گیا؟ مجھے سب سے پہلے تو اپنا گم شدہ جسم تلاش کرنا چاہیے۔ اس نے گلاس سے دو گھونٹ پانی پیا اور گلاس میز پر رکھ دیا پھر گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆☆☆

انتظار [افسانچہ]

وہ اچھا دور تھا۔

یہ وہ دور تھا جس میں لوگ ملازمت میں نہ ہونے کے برابر دلچسپی لیتے تھے۔

انیس سال کی عمر میں اس کو ملازمت مل گئی۔ خوشی کی انتہا نہ رہی، گھر میں بھی عید سماں تھا۔ والدین کا اس پُرمسرت موقع پر عالم دیدنی تھا۔

بہ قول شاعر

جھپکی ذرا سی آنکھ ، جوانی گزر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی ، ادھر گئی

.....

کے مصداق زمانہء ملازمت بڑی تیزی سے بیت گیا۔ اکتالیس سال کا طویل عرصہ ملازمت کر لی مگر مجال، اس دورانیہ میں کچھ اور کیا ہو، صرف اور ملازمت۔ ساٹھ سال عمر مکمل ہونے پر ریٹائر کر دیا گیا۔ پہلے کے جیسے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کچھ نہ کیا۔

صرف موت کا ہی انتظار۔

اب اور کیا کرنا ہے اور کیا ہونا ہے۔

صرف موت نے ہی تو آنا ہے

مگر حیرت کی بات تو یہ کہ اِس عرصہ میں اس سے نہ دین کا کوئی کام ہو سکا نہ نہ دنیا کا۔

بس انتظار ہی ہوتا رہا۔

اِسی انتظار میں مزید پینتالیس سال گزر گئے۔ عمر ایک سو پانچ سال ہو گئی مگر

ختم نہ ہوا تو

انتظار -----

عاصم بخاری

حوریہ کی خالہ [خاکہ]

رخشندہ نوید

دو دن سے حوریہ کی خالہ کی حالت کسی پتھر کے جیسی تھی۔ ٹانگوں اور پیٹ پر سوجن کے باعث اکڑاؤ سے ان کا وجود ہلنے جُلنے سے قاصر تھا۔ اُن کے وہ ملائم بال جن کو خالہ نے کبھی مہندی کی لال رنگت سے عاری نہ ہونے دیا تھا، پچھلے 6 ماہ سے بستر پر آ لگنے کے باعث مکمل سفید ہو چکے تھے اب ان کے کندھوں پر نرم روئی جیسے ریشمی بال نہیں بلکہ لٹوں کی طرح پڑی رسیاں تھیں - پچھلے کچھ برسوں سے وہ نہانے سے بہت خوفزدہ ہو چکی تھیں چند برس پہلے انھیں نمونیہ ہوا تھا۔ تب سے اُن کے دل کے اندر سے پانی سے ٹھنڈ لگ جانے کا خوف ختم نہ ہوا - چونکہ انھیں نمونیہ سردیوں میں نہانے کے بعد ہوا لگنے سے ہوا تھا اس لئے خوف کے مارے اس بیماری کی حالت میں پچھلے 6 ماہ سے شاید ایکبار بھی نہیں نہائی تھیں - اس کی وجہ سردیاں تھیں حوریہ نے ہاتھ جوڑ کر منت کرتے ہوئے کئی بار زبردستی بھی کوشش کی ان کی ملازمہ کو ساتھ ملایا دو ایک بار ان کو بہلا پھسلا کر بہانے سے باتھ روم میں لے

جانے کی کوشش بھی کی گئی مگر وہ طیش میں آجاتی تھیں۔ صلواتیں سناتیں اور مارنے کو دوڑتی تھیں یا پھر بچوں کی طرح رونے لگتیں۔ بیماری کے دوران نہ نہانے کے باعث میل اُن کے جسم پر جمع ہوتی چلی گئی اور ان کی اجلی رنگت کو بھی وقت نے میلا کر دیا تھا حالانکہ تمام عمر اُن کی رنگت بہت شفاف اور چہرہ ہمیشہ چھلکتی صحت بھری تازگی سے لبریز رہا تھا۔ مہینوں سے نہ نہانے کے باوجود عبادت گزاری میں حیات بسر کرنے والے وجود پر جو قدرتی نور قائم رہنا چاہیے وہ بدرجہ اتم حوریہ کی خالہ کے چہرے پر دکھائی دیتا رہا۔ اس بیماری کے حملے کے بعد حوریہ کی خالہ کا رنگ روپ اس لئے بھی زیادہ خراب ہوا کہ خالہ ٹھہریں خوش خوراک، خوش غذا۔ اور اب بستر ہوا ان کا ٹھکانہ تو کہاں کا پینا کدھر کا کھانا۔

اب وہ دوپٹے کی حاجت سے بھی بری ہو چکی تھیں ان کے تن پر کئی کئی دن پرانے کپڑے دیکھ کر حوریہ سوچتی خالہ کے پاس اتنے رنگ رنگ کے لباس ہیں۔ کپڑوں سے ان کی الماری بھری پڑی ہے، شنیل، ویلوٹ، جارجٹ کیسا کیسا جوڑا خالہ نے بنا رکھا ہے۔ مگر پچھلے پانچ چھ ماہ سے ان کی زندگی کا عجب موڑ آن پہنچا تھا۔ کسی بھی شے کی حاجت سے عاری ٹیرس پر بیٹھی ہوئی اب وہ کوئی مخبوط الحواس دیوانی سی خاتون لگنے لگی تھیں۔ ان کی تندرستی کے دور میں جب بھی حوریہ ان کو ملنے جاتی وہ ٹیرس کی ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر حوریہ کی گاڑی کو ہاتھ ہلاتیں اور اوپر کھڑے کھڑے اونچی آواز میں کوئی نصیحت یا پیغام ضرور دیتیں جیسے گاڑی آہستہ چلانا، فلاں راستے سے واپس جانا، سر کو ڈھانپ کر جانا، وغیرہ وغیرہ، لیکن اب وہ ٹیرس پر اپنی وہیل چیئر میں فقط ایک بت بنی بیٹھی رہتیں اور اب وہ حوریہ کی جاتی گاڑی کی جانب قطعاً متوجہ نہ ہوتیں۔

لیکن ان کی اس حالت کے باوجود حوریہ ان کی مرحومہ بہن کی اکلوتی نشانی ان کی یادداشت کا حصہ رہی ان کی بند آنکھوں نے بھی ہمیشہ حوریہ پہچانا۔ اس حال میں بھی جو نہی حوریہ سیڑھیاں چڑھ کر اُن کے بستر کے قریب پہنچتی تو وہ اسی طرح دس دس بار بند آنکھوں کے ساتھ حوریہ کا منہ چومتیں اور بار بار لیٹے لیٹے ہی اپنے گلے لگاتیں۔ دراصل ان کے اپنے چار بیٹے ہی تھے۔ دو بیٹیاں پیدا تو ہوئیں لیکن پانچ برس تک پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کے گھر کی ہو گئیں۔ حوریہ کو انھوں نے ہمیشہ سگی بیٹی کی طرح سمجھا تھا۔ حوریہ کی والدہ یعنی خالہ کی چھوٹی بہن جن کو

دنیا سے گزرے پندرہ برس ہو چکے تھے اور جن کے بعد حوریہ نے خالہ کو ہی اپنی ماں سمجھ لیا تھا۔ خالہ صوفیہ بھی اپنی بہن کی نشانی سے محبت محض فرض سمجھ کر نہ کرتی تھیں یا اس لیے نہیں کہ اس کی ماں فوت ہو گئی بلکہ انہیں حوریہ سے واقعتہً دلی لگاؤ تھا۔ سو یہ ایک طرح کا مضبوط سا روحانی رشتہ تھا جسے ہمیشہ دونوں طرف سے بہت خوش اسلوبی سے نبھایا گیا۔ جب سے خالہ کو سٹروک کے بعد چلنے پھرنے اور بولنے میں دشواری شروع ہوئی، حوریہ نے اپنے سارے کام چھوڑ کر خالہ کے گھر آنے جانے کو اپنی ڈیوٹی بنا لیا تھا۔ یوں تو جب سے خالہ اس حال میں آئیں حوریہ خالہ کا خیال کرنے کے لیے زیادہ ان کے گھر آنا چاہتی تھی لیکن ایسا کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ اور مشکل بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ خالہ کی بہو اس کو عجیب نظروں سے دیکھتی تھی۔ جیسے حوریہ خالہ پر اس حال میں اپنی مہربانی کیوں لٹانے آتی ہے۔ حالانکہ حوریہ ایک تڑپ کے تحت خالہ کے گھر کھنچی چلی آتی تھی۔ خالہ کے تیسرے نمبر کے بیٹے نے تو اپنا گھر بدیس میں بسا لیا تھا وہ کبھی کبھار فون پر حال پوچھ کر اپنا حصہ ادا کر لیتا۔ دوسرے نمبر والے سپوت نے خالہ کے گھر سے تقریباً

آدھے گھنٹے کے فاصلے پر اپنا الگ گھر خرید لیا تھا۔ سو دور ہونے کے باعث ان کے پاس جواز تھا کہ وہ گھر بار بچوں کے معمولات اور بیوی کی نوکری کے ہوتے ہفتہ اتوار کو بھی مصروفیت کا جواز بنائے رکھتے تھے۔ دو بیٹے جو خالہ کے ساتھ رہائش رکھتے تھے ان کی بیگمات کے بیچ بھی خالہ کی دیکھ بھال، ان کو کھانا دینے پر جھگڑے رہتے تھے چونکہ دونوں کا کچن الگ تھا۔ حوریہ کا خالہ کے گھر اتنی فراوانی سے آنا ہمیشہ ہی ان کو کھٹکتا تھا۔ خالہ بھی تو ان کے سامنے حوریہ سے بہت زیادہ محبت کا اظہار کرتی تھیں جیسے حوریہ ان کی اپنی ہو اور وہ غیر بلکہ دشمن کے قریب قریب حد تک پرائی۔ حوریہ کے اس گھر میں اتنا اہم ہونے پر کئی بار ایشو بنا لیکن بیماری سے پہلے خالہ بہت جی داری سے مخالفت کے باوجود حوریہ کو ہفتے دس دن کے بعد اپنے گھر بلاتیں۔ اس کے لئے کھانے بنتے اور پھر دونوں دو سہیلیوں کی طرح گپیں مارتیں اور خوب ہنستیں۔ خالہ صوفیہ دراصل بہت خوش مزاج خاتون رہیں ہیں۔ حوریہ کی امی بھی کھلکھلاتی ہوئی ڈالی تھیں۔ اور یہ بڑی بہن بھی ہر وقت کسی نہ کسی ہنگامے اور میلے کی تلاش میں رہتی تھیں زندہ دلی ان پر ختم تھی۔ حوریہ نے خالہ

میں ہر پل اپنی ماں کو ڈھونڈا اور ان کے گھر کا راستہ اس کی جائے اماں بنا رہا۔ اب جب خالہ اس حالت میں تھیں تو حوریہ کو یہ محبت میں بے ایمانی اور دل میں کھوٹ والی بات لگتی کہ جب تک خالہ تندرست رہیں ان کی محبت دونوں ہاتھوں سے لوٹی اور اب جب وہ ایسے حال کو پہنچیں تو ان سے ملنا چھوڑ دیا جائے۔

آج حوریہ صبح بارہ بجے کے قریب اُن سے ملنے گئی تو اس کی آواز پر آخری بار انھوں نے آنکھیں کھولیں اور زیرِلب کچھ بڑبڑاتی رہیں۔ ان کی زبان میں لکنت کے باعث سمجھ میں آنے والا کچھ بھی نہ تھا۔ کئی ماہ سے وہ کسی قسم کی گفتگو کے قابل نہ تھیں۔ حوریہ بس اپنے تجربے کے باعث سن کر سمجھ لیتی تھی، حوریہ اپنی والدہ کی وفات کے بعد ہزاروں بار تو ان کے گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر ملاقاتوں کے دوران ان کے دل کی سننے اور اپنے دل کی سنا کر خود کو بھر چکی تھی۔

وہ اکثر کہا کرتی تھیں۔ میرے کسی بیٹے نے میری بات نہیں مانی ورنہ میں تجھے کسی اور کے گھر نہ جانے دیتی۔ تجھے اپنی بہو بنا کے اپنے گھر رکھتی۔ اور حوریہ جواب میں کھلکھلا کر ہنسا کرتی۔ یہ بات خالہ کو کہنے کی اس نے کبھی ہمت نہ کی لیکن وہ دیکھتی تھی خالہ اتنی عبادت گزار، اتنے اچھے اخلاق کی مالک ہونے کے باوجود پوری ساس ہیں۔ خالہ کی اپنی چار میں سے کسی بھی بہو سے بن نہ پائی۔ حوریہ بہت غور کرتی کہ خالہ اتنی تو اچھی ہیں پھر بھی ان کے گھر میں یہ بدمزگیاں کیوں! حوریہ جب جب خالہ کی ذات کے اس پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی تو اسے محسوس ہوتا کہ خالہ کو اپنی کوئی بھی بہو اچھی نہیں لگتی۔ اور حوریہ شکر ادا کرتی کہ اس کی اپنی خالہ سے اتنی دوستی کبھی نہ رہتی اگر خالہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتیں۔

خالہ پر بیماری آئی تو جو دو بیٹے ان کے ساتھ تھے خالہ ان کے بیچ فٹبال بن گئیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی انہیں سنبھالنے پر بخوشی راضی نہ تھا۔ اور اس دنیا کے دستور کے مطابق خالہ سب پر بوجھ بن گئیں۔ سب ایک دوسرے پر یہ بوجھ ڈالنے کی کوشش میں تھے۔ شہر میں موجود تین بیٹے اور ایک بیرون ملک رہنے والے بیٹے سمیت ہر کوئی ماں کی موت کے انتظار میں تھا علاج کروانے میں کوئی پہل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ خالہ لاوارثوں کی طرح زندگی کے یہ دن گزار رہی تھیں۔ وہ تو اچھا ہے اس سٹروک سے ان کی سوجھ بوجھ اثرانداز ہونے سے انہیں بہت زیادہ پتہ نہیں چلتا

تھا۔ لیکن حوریہ کو معلوم تھا کہ خالہ سب سنتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں۔ خالو کی وفات کے بعد جو جائیداد وہ چھوڑ کر گئے سب خالہ کے نام تھی اور جائیداد کا لالچ اب خالہ کے بیٹوں بہوؤں کے ساتھ ساتھ اگلی نسل یعنی ان کی اولاد تک بھی جا پہنچا تھا۔

خالہ بہت مدت سے ایک آرام دہ (عقل نمیں تے موجاں ای موجاں کے مصداق) زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ تمام لوازمات امور خانہ داری سے ریٹائر تھیں۔ ان کے معمول میں نماز، روزہ، نفل، اور قرآن کے سوا شاید اپنی پنشن کو ناداروں میں بانٹنے، سڑک پر راہ چلتوں کو پیسے دینے کے سوا کچھ شامل نہ تھا۔ کئی عورتوں کے انھوں نے ماہانہ لگا رکھے تھے تقریباً روزانہ وہ اپنے علاقے کی گراؤنڈ سے ملحقہ پارک جاتیں۔ اور ایک دو چکر سیر کی غرض سے باغ کے بھی لگاتیں۔ کچھ برس پہلے خالہ صوفیہ نے اسی لیڈیز پارک میں ایک استانی سے از سر نو قرآن پاک اعراب کے ساتھ پڑھا تھا۔ قرآن پاک پڑھنے کے بعد ان کے بھائیوں نے ان کی آمین کی تھی ان کو ہار پہنائے تھے۔ بیماری سے قبل ان کا مصرف حیات بس اللہ اللہ کرنا تھا۔ نہ کھانا پکانا، نہ کچن میں جانا۔ نہ ہی کوئی ذمہ داری۔ حالانکہ وہ بہت مزیدار کھانے پکانا جانتی تھیں۔ مگر آہستہ آہستہ ان کو گھر کے سسٹم سے دور کر دیا گیا تھا۔ حوریہ کی خالہ کو اللہ تعالیٰ نے شائستی اور سکون دل جیسی نعمت سے نواز رکھا تھا۔ وہ بہت دکھی ہونے کے باوجود بھی یہی کہتی تھیں اللہ کی ذات میرے ساتھ ہے تو مجھے اور کیا چاہیے۔

ان کے مسائل بھی کچھ ایسے خاص اور اہم نہ تھے۔ مگر دھیرے دھیرے ان کے گھر کے حالات زیادہ خراب ہوئے تو دونوں ساتھ رہتے بیٹوں اور ان کی بیویوں نے ان کے تین وقت کے کھانے کو مسئلہ بنا دیا۔ اور وہ روٹی کے ٹکڑوں کا جھنجھٹ ان کی زندگی کا ناسور بنا رہا۔ حوریہ اکثر ان کو کہا کرتی تھی ''اگر آپ اپنی بہوؤں سے بنالیں، تو آپ فرشتوں میں شمار کی جائیں، کیونکہ آپ کے اندر کی یہ عبادت گزار اور غریب پرور ہستی دور دور تک نظر دوڑانے پر بھی کم دستیاب ہوتی ہیں۔ بہت برسوں سے ان کے جینے کا کوئی اور مقصد تھا ہی نہیں۔ گراونڈ کی کچھ خواتین کے خاندان پالنا، نمازیں پڑھنا یا پھر گھر کے قریبی کسی بازار سے ڈھیروں سوٹ خرید خرید کر الماری بھرنا اور بوقت ضرورت راہ خدا میں بانٹ دینا۔ ہر دکاندار ان کی پیروں کی طرح عزت کرتا اور ان

سے کوئی رشتہ ضرور قائم کر لیتا اور انھیں خالہ جی، پھوپھو جی اور ماں جی جیسے ناموں سے پکارتا تھا۔ خالہ اکثر آدھی رقم رکھوا کر سوٹ کی بکنگ کروا لیتیں اور پھر دوبارہ جا کر باقی رقم ادا کر کے کسی وقت وہ سوٹ اٹھا لیتیں۔ حوریہ کو بھی خالہ نے اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹوں سے نوازا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی الماری، اس میں جمع شدہ نالے، پراندوں، دانتوں پہ ملنے والا مسک، اپنی الماری میں رکھے ڈبہ بند گفٹ جو اکثر انہیں تحفہ میں ملتے، سب سے بے خبر ہو چکی تھیں۔

اللہ نے ان کو ایک غیر معمولی اضافی طاقت سے نواز رکھا تھا۔ حوریہ کو انھوں نے بسا اوقات بتایا کہ چھ بچوں کی پیدائش پر ہر بار وہ دیسی گھی کا پورا بیس کلو کا کنستر کھایا کرتی تھیں۔ اسی لیے تو ابھی چند ماہ پہلے تک خالہ صوفیہ کی آواز کا کڑکا دور دور تک سنا جا سکتا تھا اور ان کی صحت اس حد تک برقرار تھی۔ کہ لاؤڈ سپیکر والا کام کر لیتی تھیں۔ چھت پر گئے بچوں کو بس دو آوازیں دیتیں اور ان کی صدا پورا محلہ سنتا۔ ان کا نظام ہضم اچھوں اچھوں سے اچھا تھا۔ اُن کے بقول اچھے وقتوں میں وہ دس چپاتیاں بڑے آرام سے کھا لیا کرتی تھیں۔ بس یکدم بیٹھے بیٹھے ان کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ شائد عمر کا تقاضا یا کوئی اندر چھپا صدمہ۔۔ انھیں اپنے بیٹوں کی ماں سے عدم توجہی کا غم تو بہت تھا ان کو کوسنے کے ساتھ وہ ان کے لئے ہمیشہ جھولی اٹھائے رکھتیں۔ پچھلے دو تین دن سے حالت زیادہ بگڑنے کے سبب وہ جو تیرس پر وہیل چیئر پر بیٹھی رہتی تھیں اس سے بھی چلی گئیں۔ اس روز حوریہ بھی صبح سے وہیں تھی ان کے سرہانے بیٹھی ان کے پیٹ کی حرکت سے اندازہ کر رہی تھی کہ خالہ کی سانس چل رہی ہے وگرنہ تو وہ بے حس و حرکت پڑی تھیں۔

شام تک حوریہ نے دیکھا خالہ کا ہاتھ پوری طاقت سے اُٹھ کر ماتھے تک جاتا اور ہر تھوڑی دیر کے بعد ان کا ہاتھ نادیدہ ارواح کو سلام کرنے لگتا جیسے کوئی ان کے پاس آیا ہو جسے اور کوئی دیکھ نہ پا رہا ہو۔ حوریہ نے خالہ کی چھوٹی بہن یعنی اپنی والدہ کا صدمہ آنکھوں سے دیکھا تھا ان کی روح کو پرواز کرنے کا منظر آج بھی اس کے بدن کو سن کر دیتا تھا۔ اس شام حوریہ کی آنکھوں کے سامنے دو بیٹوں کی موجودگی میں رات بارہ بجے کے قریب خالہ صوفیہ نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ حوریہ ان کے سرہانے بیٹھی تھی۔ حوریہ نے اپنی امی کے بعد آج کسی کو دوسری بار آخری سانس لیتے دیکھا تھا حوریہ کا نچے

کانپتے سکون کے ساتھ کھڑی رہی بس ایک بار آخری بار حوریہ نے خالہ کے سرد ہونے کے قریب ماتھے کو آخری بوسہ دیا۔۔۔

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے خالہ کو خدا حافظ کہا، خالہ جی اللہ کے سپرد، آپ محفوظ ہاتھوں میں چلی گئی ہیں۔ اللہ اب آپ کو خود سنبھالے گا۔ جاؤ صوفی خالہ اب آپ کو تین وقت کھانے کے لیے در در بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ حوریہ کو شدت سے یہ احساس تھا کہ خالہ نے بیماری کی حالت کسمپرسی سے گزاری تھی۔ حوریہ کو ایک حد سے زیادہ خالہ پر مہربان ہونے کا ان کے گھر والوں نے حق نہیں دیا تھا۔ ورنہ وہ انہیں اپنے گھر لے جا کر رکھتے اور ان کی اس بیماری کو باعزت طریقے سے بسر کروانے کی شدید خواہش رکھتی تھی۔

خالہ کی دنیا سے اٹھ جانے کی خبر ارد گرد گھروں میں پھیلی تو ایک ہجوم چند منٹ میں اکٹھا ہو گیا۔ کوئی دھیما، کوئی بلند آواز میں رو رہا تھا۔ حوریہ اس دم ان سب سے لاتعلق تھی۔ جیسے وہ کسی کو جانتی ہو، نہ ہی پہچانتی ہو۔

خالہ کو جی بھر کے خاموشی سے کھڑی دیکھتے ہوئے وہ رات بارہ بج کے تیس منٹ پر کسی کو پوچھے بتائے بغیر خالہ کی سیڑھی کبھی دوبارہ نہ چڑھنے کے لیے اتر آئی۔ حوریہ کے دل میں ان تمام چہروں کو روتا ہوا دیکھنے کی ہمت نہ تھی، جو اب خالہ کے پاؤں پکڑے غم سے نڈھال تھے۔ حوریہ کو خالہ کی بیماری نے ایک بات تو باور کرا دی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایسے سلوک کی مستحق نہ تھیں۔

محلے دار سب خالہ صوفیہ کے دیوانے تھے۔

حوریہ سب کے بیچ سے نظر جھکائے کانوں پر ہاتھ رکھے سر منہ لپیٹے، گاڑی میں بیٹھی اور وہاں سے بھاگ آئی۔ گاڑی کے دروازے بند کرتے ہی حوریہ کی چیخیں گاڑی کے اندر گونجنے لگیں۔ اور وہ کبھی اپنی امی کو آوازیں دیتی اور کبھی خالہ کو۔

آنکھ کھلی تو حوریہ نے اپنے شوہر کو اپنا چہرہ دھیرے دھیرے تھپتھپاتے ہوئے یہ بولتے ہوئے سنا۔

حوریہ بیگم کیا ہوا کیوں چیخیں مارے جا رہی ہو۔ وہ بہت پریشان حوریہ کے سرہانے کھڑا تھا حوریہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ صبح کی مدھم روشنی پردوں سے چھن چھن کر بستر کی سلوٹوں سے کھیل رہی تھی حوریہ نے گہرا سانس بھرا اور خود پر حیران ہوئی کہ یہ رات بھر مری ناہنجار آنکھوں نے خواب ہی خواب میں کیا کیا دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

ایسی احتیاط سے احتیاط بھلی

زندگی میں احتیاط کرنا بڑا ضروری ہے لیکن احتیاط ایک حد سے بڑھ جائے تو پھر احتیاط ہی باقی رہتی ہے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک انکل اسی ٹائپ کی احتیاط کے قائل ہیں۔ آپ زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکے سوائے احتیاط کرنے کے۔ اسی احتیاط کی بنا پر گھر سے نکلنا اُن کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں اور دوسری طرف اُن کا گھر میں رہنا گھر والوں کے لیے اک عذاب سے کم نہیں۔ انکل کا نام اخلاق صاحب ہے لیکن اُن میں اخلاق نام کو بھی نہیں ہے۔ گفتگو ایسی کہ بندہ سر پکڑ لے۔ بس!'' کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی۔''

انکل پوری زندگی بدترین احتیاط کے مرتکب رہے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ اگر انھیں تیمّم بھی کرنا پڑے تو پانی کے ساتھ کرتے ہیں اور اگر انھیں آبِ حیات بھی میسّر ہو تو اُسے ابال کر پئیں گے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس قدر اذیّت ناک احتیاط کے باوجود دنیا میں شاید ہی کوئی بیماری ہو، جس کے ساتھ انکل کی باقاعدہ ہاتھا پائی نہ ہوئی ہو۔ بے شمار ڈاکٹر حکیموں سے، ان بیماریوں کے توسط سے، انکل کے ذاتی مراسم ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ انکل کو جلد پر ہلکا سا دانہ بھی نکل آئے تو اُن کا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ جلد کا کینسر ہے۔ پھر اس کے بعد انھیں اس بات پر قائل کرنا اک عذاب سے کم نہیں کہ یہ اک دانہ ہے کینسر نہیں ہے۔ اُن کی سوچ کا انداز کسی اناڑی تھانیدار کی طرح ہوتا ہے جو جرم سے مجرم کی طرف جانے کے بجائے مجرم سے جرم کی طرف آنے کی کوشش کرتا ہے۔ انکل بھی پہلے کسی بیماری کا تعین خود سے ہی کر لیتے ہیں اور پھر اس کی علامات تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً اگر انھیں سر میں ذرا سا درد ہو تو وہ طے کر لیے ہیں کہ انھیں ابھی برین ہیمرج ہونے والا

ناصر محمود ملک

ہے اور انھیں اس قدر یقین ہوتا ہے کہ وہ باقاعدہ یہ ہدایات بھی جاری کر دیتے ہیں کہ "قومے" کے دوران اُن کا خیال کیسے رکھا جائے گا۔ اس کے بعد وہ متعلقہ علامات کی تلاش شروع کرتے ہیں۔ بعد میں جب ایسا نہیں ہوتا تو گھر والوں کی طرح انھیں بھی مایوسی ہوتی ہے۔

انکل فوٹو کاپی کروانے کے شوقین ہیں۔ وہ انتہائی احتیاط اور انجانے خدشات کے پیشِ نظر، اپنے ہاتھ لگنے والے ہر کاغذ کی سب سے پہلے فوٹو کاپی کروائیں گے۔ اس بات پر ان کی تاکید اور احتیاط دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کا بس چلے تو وہ خود اپنی بھی ایک فوٹو کاپی کروالیں اور گھر سے باہر بھیجنا ہو تو فوٹو کاپی کو بھیجا کریں اور اصلی یعنی خود کو گھر میں رکھا کریں۔ ایک دو مرتبہ انھوں نے گھر والوں سے اس بات کا اظہار بھی کیا ہے۔ گھر والوں کو بھی یہ آئیڈیا بڑا پسند آیا ہے بس فرق صرف یہ ہے کہ گھر والے کہتے ہیں کہ وہ خود باہر جایا کریں گے اور فوٹو کاپی گھر میں رہے گی۔ فوٹو کاپی کے لیے ان کی احتیاط اس سے ملاحظہ فرمائیں کہ اُن کے پاس مکان کی رجسٹری سے لے کر محلے کے سٹور سے خریدی ہوئی ڈبل روٹی کے بل کی فوٹو کاپیاں موجود رہتی ہیں۔ گھر میں کئی صندوق ان کاغذات سے بھرے رکھے ہیں۔ ایک کمرہ خاص طور پر ان کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ ہر کاغذ کی دو تین فوٹو کاپیاں کروا کے مختلف جگہوں پر سنبھال رکھی ہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ان کو جب بھی کسی ایسے کاغذ کی ضرورت پڑتی ہے جو انھوں نے اپنے تئیں بہت سنبھال کر رکھا ہوتا ہے تو وہ ان کو کبھی نہیں ملتا۔ پھر جو اس کاغذ کی تلاش شروع ہوتی ہے تو گویا اک طوفانِ بدتمیزی بپا ہو جاتا ہے۔ ہر گمشدہ کاغذ انکل کے نزدیک زندگی کے پروانے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی تلاش یوں کی جاتی ہے جیسے دیارِ غیر میں کوئی مسافر ایئرپورٹ جانے سے پہلے اپنا گمشدہ پاسپورٹ تلاش کر رہا ہو۔ پھر حواس باختگی کے عالم میں سارا دن چھان پھٹک، اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی ہے اور کئی اور چیزیں دائیں بائیں ہو جاتی ہیں۔ بالآخر بچوں کو دو تین مرتبہ زدوکوب کرنے اور خود اتنی ہی مرتبہ بیگم سے زدوکوب ہونے کے بعد رات گئے جب وہ کاغذ ملتا ہے تو پتہ چلتا کہ کہیں بالکل پاس

ہی دھرا تھا۔ انکل نے گھر میں احتیاطاً ایک انتہائی خفیہ تہہ خانہ بھی بنا رکھا ہے۔ اس کے استعمال کی اجازت اُن کے علاوہ کسی اور کو نہیں ہے۔ انکل کہتے ہیں کہ حالات کا کچھ پتہ نہیں نجانے کب خراب ہو جائیں اور جنگ وغیرہ لگ جائے۔ یہ تہہ خانہ اسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ انکل دن میں کئی مرتبہ اس کمرے کا استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے محلے میں شادی وغیرہ میں کوئی پٹاخہ بھی چلے تو انکل بھاگ کر تہہ خانے میں چھپ جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں تیسری عالمی جنگ شروع ہوگئی ہے۔ پھر اندر سے ہی فون پر پوچھتے رہتے ہیں کہ فوجیں کہاں تک پہنچ گئی ہیں۔ وہ خوف کے مارے جس کمرے میں چھپتے ہیں یقین جانیے ہمیں تو اسے دیکھ کر ہی خوف آتا ہے۔ اس میں کوئی کھڑکی، دروازہ، روشن دان کچھ بھی نہیں۔ بس اک قبر نما گڑھا سا ہے اور اس تنگ و تاریک، گھپ اندھیر گڑھے میں جانے کے لیے جس حوصلے اور ''دلیری'' کی ضرورت ہے وہ صرف انکل کے پاس ہے۔

انکل سے بحث کا مزا آتا ہے۔ ان کی گفتگو مقصد، مطلب، منطق اور دلیل وغیرہ جیسی ''خرافات'' سے بالکل ''پاک'' ہوتی ہے۔

ایک دن فرمانے لگے، ''ٹیپو سلطان کے لیے میرے دل میں بہت احترام ہے لیکن وہ جو ان کا قول ہے کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' میں اس کے ساتھ بڑے ادب سے اختلاف کرتا ہوں۔'' میں نے کہا انکل یہ تو بڑا زبردست قول ہے۔ اس میں بہادری اور بے خوفی کی بات کی گئی ہے۔ کہنے لگے۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھئی! لیکن دیکھیں نا! شیر کی صرف ایک دن کی زندگی یعنی بس صرف چوبیس گھنٹے! اور دوسری طرف سو سالہ زندگی۔ کوئی تناسب نہیں بنتا۔ شیر کی کوئی پچاس سالہ زندگی بھی ہو تو بھی کچھ بات بنے۔ دیکھیں نا! جان ہے تو جہان ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کسی خوف کا شکار ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں ڈرتا ورتا کبھی نہیں۔'' انکل یہ بات کر رہے تھے تو باہر گلی میں غالباً کوئی بڑا غبارہ بڑے زور سے پھٹا۔ اس پر انکل فوراً اور تیزی سے اُٹھے اور تہہ خانے کی طرف بھاگ گئے۔

☆☆☆☆☆

سید محمد جعفری کی مزاحیہ نظم ایبسٹریکٹ آرٹ پر دو سہیلیوں کا دلچسپ مکالمہ

سیدہ آمنہ ریاض

(ثمینہ، باجی راشدہ کے گھر جاتی ہے۔ راشدہ اسے ایبسٹریکٹ آرٹ کی نمائش کا آنکھوں دیکھا حال سناتی ہے)

ثمینہ: السلام علیکم بہن!

راشدہ باجی: وعلیکم السلام، کیسی ہو بہن؟

ثمینہ: ہاں بہن میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ سنا ہے بڑی نمائشوں کے چکر لگ رہے ہیں؟ پٹرول کی قیمتیں آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں اور میڈم کے ٹورے پھیرے ہی نہیں مکتے؟؟؟

راشدہ بہن: ہائے ہائے نہ پوچھ بہن چھریاں چل گئی ہیں دل پر۔ رہ رہ کے مجھے پٹرول یاد آرہا ہے جو ضائع ہو گیا۔
آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

.....

ثمینہ (انگشت بدنداں ہو کر): آئے ہائے باجی! آخر ایسا بھی کیا دیکھ لیا؟ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے؟

راشدہ باجی:
ایک تصویر کو دیکھا جو کمال فن تھی
بھینس کے جسم پہ اک اونٹ کی سی گردن تھی

ثمینہ: ہیں؟؟؟ اتنے پیسے خرچ کر کے دیکھا بھی تو کیا دیکھا؟ ویسے مجھے اونٹ کے نام سے بکرا عید یاد آ گئی ------

راشدہ باجی: اوہو ---...... تجھے تو ہر وقت کھانے کی پڑی رہتی ہے ---- آگے بھی تو سنو کہ کیا ہوا؟؟

بولی تصویر جو میں نے اسے الٹا پلٹا

ثمینہ: ہائے میں مرگئی --- یعنی کہ تصویر ہی بول پڑی؟؟؟

راشدہ باجی: اوہو -- بات تو پوری سن لیا کر --- اتنی بھی کیا جلدی ہے ---

بولی تصویر جو میں نے اسے الٹا پلٹا
میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں سیدھا الٹا

.....

ثمینہ: پاجامہ؟؟ ہائے پجامے سے یاد آیا- میں نے منے کا پجامہ سوکھنے ڈالا تھا---

راشدہ باجی: ایک تو --- تو بھی ناں --- اپنے کام پورے کر کے آیا کر--

ثمینہ: اچھا باجی ناراض نہ ہوں --- آگے بتائیں -- پھر کیا دیکھا؟ یہ تو نمائش کم اور سرکس زیادہ لگ رہی ہے-

راشدہ باجی:

ایبسٹریکٹ آرٹ کے ملبے سے یہ دولت نکلی
جس کو سمجھا تھا اناس وہ عورت نکلی

ثمینہ: (زوردار قہقہہ لگاتی ہے) ہاہاہا!!! کیا یاد کرا دیا -- میری پھپھی کی شکل بھی اللہ بخشے --- بالکل اناس جیسی تھی --- ہاہاہا --- بھئی بڑا مزہ آرہا ہے --- کاش میں بھی اس نمائش میں چلی جاتی ---- جلدی بتاؤ آگے کیا ہوا؟؟

راشدہ باجی:

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے ہیں
ڈر کے ماؤں کے کلیجے سے چمٹ جاتے ہیں

.....

ثمینہ: ہائے چھوٹے بچے بھی --- اف --- مجھے چکر آرہے ہیں ---- ارے کوئی پیپسی منگاؤ -----

راشدہ باجی: نمائش میں تو میں گئی تھی اور چکر تجھے آرہے ہیں؟؟؟ آخری دلچسپ بات تو سن لے --- شاباش ---

میں نے یہ کام کیا، سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نا تھی اک خواب تھا دیوانے کا

.....

ثمینہ غصے سے: یہ سب کچھ سنانے کے لیے میرا اتنا قیمتی وقت برباد کیا --- نہ کچھ کھلایا نہ پلایا گلاس توڑا بارہ آنے-

راشدہ باجی: میں نے سوچا اپنا برباد کیا ہوا وقت ہی بانٹ لوں

ثمینہ: ہیں جی؟؟؟

راشدہ باجی: ہاں جی ----

☆☆☆☆☆

To Make Escape

فرار

Have a look at the majestic mountains	کوہسار کیسے ہیں
Eyesight is just following up	اے محیطِ بینائی
How those snowscapes look marvellous	برف زار کیسے ہیں
Solitariness is prevailed by ,	اے بسیط تنہائی
Even it is persuaded by every where	جم گئی ہے پہنائی
Thus , the torrid sun is splitted up into many parts.	دھوپ پارا پارا ہے
Striving of existence	جسم کی توانائی
Is the last possiblilty	آخری سہارا ہے
The day of ascension is springing up everywhere	روح کا ستارا ہے
nevertheless, on the verge of hope	آس کے کنارے پر
We can speculate the scene of death	موت کا شکارا ہے
Therefore at the edge of life	زندگی کے دھارے پر
It has to be decided	انتخاب کرنا ہے
Whether we have to cross over the path or no	گھاٹ تو اُترنا ہے

خالد احمد

مترجم: تعبیر علی

ریت پر ساحلوں کی لگتی ہیں

ریت پر ساحلوں کی لگتی ہیں

ایک جیسی ہی سیپیاں، یوں تو

پھر بھی سب ایک سی نہیں ہوتیں

وہ نمائش کا منتظر، موتی

ہر کسی سیپ میں نہیں ہوتا!

یوں ہی یہ بات بھی حقیقت ہے

جس قدر، جس طرح کی آنکھیں ہوں

رات آتی ہے ایک سی اُن پر

اور اُن کے حصار میں بکھرے

خواب گو بے شمار ہوتے ہیں

ہر کوئی با ثمر نہیں ہوتا

صبح تعبیر کے اُجالوں کی

ہر کسی کو ضیا نہیں ملتی

امجد اسلام امجد

والتّین وزیتون

امن کا انعام پائیں گے قسم زیتون کی
ہم بھی اس قریئے میں جائیں گے قسم زیتون کی

شادمانی ہے نویدِ احسنِ تقویم پر
ہونٹ کیا دِل مسکرائیں گے، قسم زیتون کی

اسفل و سافل بنے ہیں آدمی کردار سے
خام پختہ پھل نہ پائیں گے قسم زیتون کی

کہہ رہی ہے آسماں کی نیلگوں روشن فضا
چاند تارے جگمگائیں گے قسم زیتون کی

صاحبانِ شوق سے پیماں ہے اہلِ نُور کا
طُور پر جلوے دکھائیں گے قسم زیتون کی

فتح پائیں گے فقط اعمالِ صالح کے نقیب
شر کے حامل مات کھائیں گے قسم زیتون کی

فیصلہ گلزار ہو گا نیت و ایمان پر
مال وزر کب کام آئیں گے قسم زیتون کی

گلزار بخاری

نشست خالی ہے

بہار مرثیہ خواں ہے کہ رازداں اس کا
چلا گیا ہے اِک ایسے خزاں کدے کی طرف
جہاں بچھاتے ہیں پھولوں کی چادریں لاکر
جہاں اُداس ہوا سائیں سائیں کرتی ہے
جہاں عروج ہے صدمے بھری خموشی کا
شکستہ برگِ صدا ہے کہ دستِ قدرت نے
طریق نوحہ گری کا عطا کیا ہم کو
کسی سے جب کوئی بچھڑے ملال ہوتا ہے
بکھیرتا ہے وجود اضطراب کے نغمے
چھنے سکون طبیعت میں بے قراری ہو
ہمیں ملا تھا کوئی قدردان جیون کا
سُخن کا مرتبہ داں آگہی کا حامل بھی
اُسی کا ہم کو قصیدہ نگار ہونا تھا
گہر سے اشک ہمارے تلاش کرتے ہیں
اُسی کی چشم کے جو ہر شناس دامن کو
بجا کے فصلِ نمو تازہ گل کھلاتی ہے
مگر جُدائی کا آزار کم نہیں کرتی
گئے ہوؤں کو بھی واپس بلا نہیں سکتی
بھرے ہوئے ہیں شجر برگ و بار سے لیکن
چمن کے کُنج میں اُس کی نشست خالی ہے

دیر سے آنے والی نظمیں

یہ دیر سے آنے والی نظمیں ہیں
زیادہ تر نظمیں ویسے بھی دیر ہی سے آتی ہیں
کسی جہاز ران کے بھیجے ہوئے خط کی طرح
جو اُس کے ڈوب جانے کے بعد پہنچتا ہے۔

اتنی تاخیر کہ ان کا کچھ فائدہ باقی نہیں رہتا، ایسے خط
اور دیر سے آنے والی نظمیں ایک سی ہوتی ہیں۔
ایسے پہنچتی ہیں گویا آبی راستے سے آئی ہوں۔

جو کچھ بھی تھا، سب ہو چکا۔ سب رفت گزشت۔
لڑائی، دھوپ بھرا دن، ہوس اوڑھے ہوئے چاندنی، الوداعی بوسہ۔

یہ نظم لہروں کے شانوں پر ساحل کی طرف بہتی آ رہی ہے
کسی غرق شدہ جہاز کے ملبے کی طرح۔

یاد دیر سے مراد
جیسے رات کے کھانے پر دیر سے پہنچنا:
تمام الفاظ ٹھنڈے ٹھار یا کھائے ہوئے (محسوس ہوتے ہیں)۔
بدمعاش، حالت زار اور مغلوب،
یا کسل مندی، قیام، ثاشیہ،
مردود، روئے ہوئے، بے کس و تنہا،
محبت اور شادمانی، یہاں تک کہ: تہری اذیت کے حامل گیت۔
زنگ آلود منتر، گھسے پٹے ٹل کر گائے ہوئے نغمے

بہت دیر ہو چکی ہے؛ اب رقص کرنے کا تو وقت نہیں۔
البتہ، گانا تم اب بھی گا سکتے ہو۔ سو، گاؤ۔
ٹرن اپ دی لائٹ۔ روشن اور روشن کرو: گاؤ
گیت آغاز کرو۔

شاعرہ: مارگریٹ ایٹ وڈ / ترجمہ: حامد یزدانی

کینیڈا سے تعلق رکھنے والی اعزاز یافتہ ادیبہ اور شاعرہ مارگریٹ ایٹ وڈ کی یہ نظم ان کے تازہ شعری مجموعہ ڈیئرلی سے منتخب کی ہے۔ مارگریٹ مصرعہ کہیں، نثر لکھیں یا بات کریں ان کا انداز دل چسپ، شگفتہ اور دل کش ہوتا ہے۔ ان کے ناول واقعتاً ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ دی ہینڈ میڈ ٹیلز اور اس کا دوسرا حصہ ٹیسٹامنٹ کا شمار کینیڈا کے مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ مارگریٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس سال ادب کے نوبل پرائز کے لیے متوقع ناموں کی فہرست میں بھی ان کا نام شامل رہا۔

پسینے کی جھیل [نثری نظم]

شہزاد نیّر

میں نے پیشانی کی شیلف خالی کر دی
تا کہ وہ ترتیب سے رکھ لے
اپنے تمام الزام
اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے
اور مجھ سے فائدہ اٹھالیا
بھر گئے ہم دونوں
مفاد سے وہ
الزام سے میں!
بدنصیبی سے بڑا طعنہ
اور دولت سے بڑا تمغہ
کہیں دنیا میں ہو تو بتاؤ!

وہ میرے پسینے سے اپنا ظرف بھرتا ہے
میں سوکھنے لگوں تو لگا دیتا ہے
کسی اور کو پسینہ بہانے پر
زمین پر نہ انسان کم ہیں
نہ حرص کے برتن
یہ دنیا جھیل ہے
پسینے کے قطروں سے بنی جھیل
جس کے مالک وہ ہیں
جو خود پسینہ نہیں بہاتے!

اُداس لڑکی

مرے خیالوں کی سبز ٹہنی پہ تنہا بیٹھی
اُداس لڑکی
جو چاندنی کا لباس پہنے ستارے دامن
میں بھر رہی ہے
رہِ محبّت میں ڈگمگا کر
سرابِ ہستی میں گرنے والی
اداس لڑکی
گزشتہ لمحوں کی بے وفائی کے تپتے صحرا
کی ریت میں گم
گہر محبّت کے ڈھونڈنے میں مگن ہے لیکن
بدن کے گلشن کی ٹہنی ٹہنی پہ تازہ غُنچے
مچل مچل کر بہارِ نَو کی نوید سب کو سنا رہے ہیں
فضا معطر بنا رہے ہیں
چھچھورے گُلچیں بھی گھات میں ہیں
جو اِس کی خُوشبُو مشامِ جاں میں انڈیلنے کی
تمنا لے کر ہوس کدے میں بھٹک رہے ہیں
تڑپ رہے ہیں
کوئی محبت کی پیاسی لڑکی کو یہ بتا دے
وفا کا پانی جفا کے صحرا کی دور گہری تہوں
میں گم ہے
بھلا کے صحرا نوردیوں کو
وہ لَوٹ آئے
کہ شہرِ ہستی کی صبحیں اُس کو بلا رہی ہیں
اداس شامیں نئی اُمنگوں کے دیپ ہر سُو
جلا رہی ہیں
نظر جو اُس پر فدا ہوئی تھی
وہ بے وفا تھی
جو تانے بانے ہوس کے بُنتی
اسیرِ حرص و ہوا ہوئی ہے
حیا کا انکار سُن کے دشتِ انا کی وحشت
میں کھو چکی ہے
کھڑی تھی جو اُس کی رہگزر میں وہ
ظُلمتِ شب بھی سو چکی ہے
وہ لَوٹ آئے

اکرم سحر فارانی

سوال

نگر کے باسی شعور والو،
تمہارے محلوں میں آبشاریں،
یہ قمقمے اور نجانے کیا کیا
جو سب ہے لیکن
ہماری نظروں سے دور کوسوں..
..وہ سب مبارک
مگر بتاؤ؟
اگر پرندے سوال کر لیں
کہ سال پہلے جو لہلہاتے شجر یہاں تھے،
اور ان پہ ان کے جو گھر یہاں تھے.
وہ سب کہاں ہیں.؟
وہ اب کہاں ہیں؟
اگر سنو گے، تو کیا کہو گے؟
اگر پرندے سوال کر لیں؟

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا بات تھی ، کیا چھپا رہے تھے
کیا کہنا تھا اور کیا کہا تھا

ایک خوابیدہ سفر کی کہانی

کوئی محبت نہیں ہوتی
وہ کہتا ہے
تُم اپنی تنہائی کو ست رنگا بناتے ہو

تمھارے ہاتھوں میں
کالے رنگ کی پٹی ہے
جسے کوئی
تمھاری آنکھوں پر باندھ دیتا ہے
اور تم
کافی کے کسیلے گھونٹ سے
آئس کریم کا مزا لیتے ہو

وہ کہتا ہے
محبت سچ اور جھوٹ نہیں ہوتی
یہ جسم کے خول میں
روح کے اندر
غیر مرئی حالت میں پڑی رہتی ہے
ہم اگر مرتے ہیں
یہ کبھی نہیں مرتی
ہمارے چلے جانے سے
محبت کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا

وہ تو
یہ بھی کہتا ہے
محبت کے موضوع پر
کوئی فلم نہیں بنی
اور شاعری کی ساری کتابیں
الفاظ کا صدقہ ہیں

اُسے محبت کے اظہار پہ بھی اعتراض ہے
جیسے جنگل کو دھوپ سے
جہاں روشنی فطری حالت میں
پرندوں سے گفتگو کرتی ہے
خواب ستاروں سے مکالمہ کرتے ہیں
جب کہ رات نیند سے مباشرت کرتی ہے

امجد بابر

نثری نظم

میری منتظر نگاہوں میں
درد کا بسیرا ہے
چھوڑ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے
جانتے تو ہیں پھر بھی
رہ رہ کے دل مچلتا ہے
اک بار گر رشتوں میں دراڑ پڑ جائے تو
پھر معافی تلافی سے بھر نہیں سکتی
مل کر بھی دوریاں کم ہو نہیں پاتیں
فاصلے تو پھر بھی رہتے ہیں
بچھڑ جانے والے گر مل بھی جائیں تو
اجنبی ہی لگتے ہیں
بیگانگیت کی دھند چھٹ نہیں پاتی
گزر جانے والا وقت لوٹ کر نہیں آتا
گھاؤ بھر بھی جائیں
تو کسک ساتھ رہتی ہے
فاصلے ذرا نہیں گھٹتے
فاصلے تو رہتے ہیں

نائلہ راٹھور

جستجو

وہ چند سانسیں جو ایک مٹھی سی رہ گئی تھیں
کسی پٹاری کے ایک کونے میں اب بھی
ویسے پڑی ہوئی ہیں
یہ میرا ماضی جو حال ہونے کا منتظر ہے
کلام کرتا ہے کوزہ گر سے
مجھے تراشو

مجھے تراشو
کہ میری نس نس کئی زمانوں کی بے کلی میں
دھنسی ہوئی ہے
پھنسی ہوئی ہے
مجھے تراشو

عتیق احمد

مختصر نظمیں

جب کچی کچی کلیوں کے
کچھ رنگ زمیں پر پڑتے ہیں
اک یاد کا چشمہ پھوٹتا ہے
دل ڈوبتا ہے

☆☆☆☆☆

اس جھیل کے ٹھہرے پانی پر
جب نقش اجاگر ہوتے ہیں
سب روتے ہیں

☆☆☆☆☆

جب دل کی سوکھی شاخوں پر
تیری یاد کا پنچھی بولتا ہے
دل ڈولتا ہے

☆☆☆☆☆

''جب ریل کی پٹڑی رستے میں بازار سے پہلے پڑ جائے''

جس دیس میں دولت ہو کر بھی
محتاج ہوں سب اغیاروں کے
تلوار کے بدلے ہاتھوں میں
ہو کاسہ پہرے داروں کے

.....

جب دیس پہ ڈاکو راج چلے
انصاف بِکے ایوانوں میں
معصوم کی قسمت سُولی ہو
اور تاج بٹیں دھنوانوں میں

.....

جب خامے بیچیں دانش ور
ہوں دھن کی مہریں سی وی پر
''سب چَین'' کا جعلی چُورن جب
دن رات بِکے ہر ٹی وی پر

.....

جب مہنگائی کا طوفاں ہو
اور بھوک اُگے کھلیانوں میں
جب جھوٹ کی ہنڈیا چڑھ جائے
جب پتھر اُبلیں کھانوں میں

.....

جب باپ سے اُس کی بیٹی نے
اک مان سے گُڑیا مانگی ہو
جب آنکھ بھری ہو اشکوں سے
اور جیب بھی زر سے خالی ہو

.....

جب موت کا سودا ارزاں ہو
اور سانس کی قیمت بڑھ جائے
جب ریل کی پٹڑی رستے میں
بازار سے پہلے پڑ جائے

.....

پھر حاکم قاضی منصف سب
جو خادم خادم کرتے ہیں
ان چلتی پھرتی لاشوں کا
آ مل کر ماتم کرتے ہیں

عاطف جاوید عاطف

نظم

اک تماشہ سا ہے اب تلک روبرو پھر بھی خاموش ہوں

چاہتا ہوں کہ میں بھی کروں گفتگو پھر بھی خاموش ہوں

تیغ بن جائے میرا قلم دوستو اور میں ظلمت کی ساری جڑیں کاٹ دوں

یہ ارادہ مصمم ہے اور جستجو پھر بھی خاموش ہوں

خوشبو لوٹی گئی پھول مسلے گئے خواب غفلت میں وہ باغباں رہ گئے

ایسے کرداروں کی دیکھتا ہوں نمو پھر بھی خاموش ہوں

ظلم سہتا رہوں سر خمیدہ کروں ایسے جینے سے بہتر ہے پھر یوں مروں

ایسے کردار دنیا میں ہیں چار سو پھر بھی خاموش ہوں

رجب علی رجب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ صدا ہیں کہ پروئی نہ گئی سلکِ دُعا میں
سایۂ اَبر ہیں ہم سایۂ دیوار نہیں ہیں

خطوط

نسیمِ سحر

برادرم عمران منظور۔ سلام مسنون۔

آج گیارہ ربیع الاوّل ہے، یہ ماہِ مبارک آغاز ہونے سے اب تک ایک نعتیہ کیفیت طاری ہے اور کچھ نعوت کی عطائے خاص بھی ہوئی ہے۔ نعتیہ اور نعت خوانی کی محافل میں شرکت سے قلب و روح میں ہروقت آقائے نامدار، محبوبِ خدا، خاتم النبیین کی یاد آتی رہتی اور زبان سے صلِ علیٰ کا وِرد لاتی رہتی ہے۔ اسی نسبت سے مَیں آپ، بیاض کی مجلسِ ادارت کے تمام اراکین کو اور سامعین کو یومِ ولادتِ رسولؐ کی مبارک پیش کرتا ہوں ۔

اسی مناسبت سے سب سے پہلے اکتوبر ۲۰۲۲ کے شمارے میں حمد و نعت کے کچھ چنیدہ اشعار یہاں دُہرانے کی اجازت چاہتا ہوں:

تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں — نعت خود لکھی ، بہ پیرایۂ سیرت لکھی — خالد احمد

جس ضَو سے منوّر ہے یہ خانۂ ہستی — آتی ہے وہ اُنؐ کے رُخِ انوار سے ہو کر — خاور اعجاز

اے ثناگر، حرم کے راہی، درود خُوگر / خدا تمہارا، نبی تمہارا / نظر اٹھاؤ / وہ سبز گنبد کا نور ہالہ / تمہیں محبت سے اپنی جانب بلا رہا ہے (نظم سے اقتباس) محمد یٰسین قمر

میں کشکولِ سخن لے کر ادب سے بیٹھ جاتا ہوں — وہ جن لمحات میں رزقِ ثنا تقسیم کرتا ہے — سرور حسین نقشبندی

اب ہاتھ نہیں، مانگو دُعا جھولی اُٹھا کر — لو دیکھو ، ہیں مائل بہ عنایات نبیؐ جی — سید عارف معین بلے

ساتھ تیرا مرا بس یہیں تک کا تھا — زندگی اب تو جا ، میں مدینے میں ہوں — طالب انصاری

بوقتِ نعت گوئی لفظ عاجز ہوں جہاں تابش — وہاں ہم بھیگی پلکوں آنسوؤں سے کام لیتے ہیں — تابش کمال

ہے رب دینے والا تو سب لینے والے — مگر بابِ داد و سَنَد ہے محمدؐ — مرزا آصف رسول

جناب خالد علیم کا قصیدۂ نعت پڑھ کر روح سرشار ہوگئی، ایک مشکل قافیے کے ساتھ اتنا وجد آفریں قصیدہ لکھنا ان کی قادرالکلامی کو بولتا ثبوت ہے۔ اس قصیدے کے تمام اشعار کا موضوعی اور تاریخی تسلسل کچھ ایسا ہے کہ الگ اشعار لکھنے سے اس کیفیت کا اظہار نہیں ہوسکتا۔

جناب محمد ارشاد کا مضمون ''یادِ ایامے کہ'' میں منصورہ احمد کے بارے میں گذشتہ مضامین کے تسلسل میں لکھی گئی یادنگاری، جناب احمد ندیم قاسمی کے خطوط، اور خالد احمد، محمد کاظم، جناب علی عباس جلالپوری، جناب یوسف حسن کے اہم حوالے سبھی ایک عہد کی تاریخ مرتّب کرگئے۔ قائم نقوی (مرحوم) پر جناب محمد حنیف کی یادنگاری نے (مرحوم) کی شخصیت کے چند پہلو روشن کردیے۔ ناصر محمود ملک کے فکاہیے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' نے پطرس بخاری کی 'مرزا کی سائیکل' کی یاد اپنی عمدہ شگفتہ نگاری کی بنا پر تازہ کردی۔ جناب ابدال بیلا کا افسانہ ''دوسرا خط'' مکالماتی حسن کا عمدہ نمونہ اور کردارنگاری کے علاوہ ان کی کتابوں کے ذکر سے بھی اچھا لگا۔

دیگر مضامین اور افسانے ابھی پڑھ نہیں سکا کہ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن تاکہ سب کا مطالعہ کیا جاسکے۔ محض فرصت کی کمی کو دوش کیا دینا، ان دنوں کچھ پڑھنے کی رفتار بھی سست پڑگئی ہے کہ مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ والا معاملہ بھی ہے۔

غزلوں، نظموں اور افسانوں میں یہ دیکھ کر تمام اہلِ قلم کو داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ انھوں نے پاکستان میں تباہ کُن سیلابی آفت کو موضوعِ قلم بنا کر عمدہ طریقے سے اپنا فرض ادا کیا ہے اور لوحِ ادب پر اس عہد کی تاریخ رقم کردی ہے جس میں کچھ اللہ کے بندوں کی نیکی اور کچھ اہلِ سیاست کی بےحسی بھی رقم ہورہی ہے جو یومِ حساب پر گواہی کے طور پر پیش ہوگی۔

ذیل میں غزلوں کے وہ شعر لکھ رہا ہوں جو اپنی جانب توجہ مبذول کراگئے:

ہم سے آگے بڑھا نہیں جاتا — آپ ہرنی کی چال رکھتے ہیں — آصف ثاقب

نامِ ہجرت کا نہ بدنام کیا کر اے دوست — یہ بتا اب ہے نئی نقل مکانی کب تک — امجد اسلام امجد

دانہ دنکا چگنے نکلیں — چوگا لے کر گھر کو آئیں — خالد احمد

سچ چھوڑ کے اندر کا، فقط فیشنی سطریں — باقی نہ رہی لفظ کی حرمت تو تباہی — جلیل عالی

جو ایک عمر سے مشغول جنگ ہیں مجھ سے	وہ تجربے ہی مرے فکر کی اساس ہوئے	محمد انیس انصاری
مجھ میں گزر رہا ہے کہ ہے چار سو مرے	مجھ میں ہے واقعہ کہ میں خود واقعے میں ہوں	منظور ثاقب
وہ نسخہ ہم کو بھی بتلاؤ راحت	جو گھر بیٹھے ہوئے مشہور کر دے	راحت سرحدی
احتیاطاً تیری سانسیں بھی چرا کر لائی ہے	ورنہ کیا رکھا تھا تازہ پھول کی مہکار میں	طالب انصاری
ہاں یزیدی بھی ہیں حسینی بھی	کچھ بھی بدلا نہیں کہانی میں	عقیل رحمانی
وہاں ہیں سب کے سب کچے گھروندے	جہاں سیلاب کھلنا چاہتا ہے	یعقوب پرواز
کتنی چیخوں کا کسی نے بھی لگایا نہ سراغ	کتنے فریاد و فغاں ڈوب گئے پانی میں	اکرم جاذب
نوحہ کناں تھے بستی کے انس شجر سبھی	اشکوں سے بادلوں نے بھگویا تھا آسماں	رضا اللہ حیدر
سندھ بلوچستان میں اس نے لاکھوں گھر برباد کیے	اور جنوبی پنج آبے میں انت مچائی پانی نے	تسلیم کوثر
لوگ مابعد جدت میں پہنچے اساطیر سے	پھر وہاں سے نئی دیو مالا میں داخل ہوئے	شاہد ماکلی
علامت زندگی کی تھا جو پانی	وہی اب موت بنتا جا رہا ہے	ارشد محمود ارشد
باتیں کرتے پتھر اس کے سانسیں لیتی دیواریں	اک ایسا بھی گھر تھا جیتا جاگتا دریا برد ہوا	علی عارف
یقیں مانو، کسی کی بھی نہیں سنتا، نہیں سنتا	یقیں مانو، کہ اپنی آئی پہ آ جائے جب دریا	اکرم ناصر
ہر طرف موت کے ہیں ہرکارے	کانپتے ہاتھ دعاؤں میں ہیں	احمد محمود
سال بھر اس کی مشقت کا صلہ نانِ جویں	سوچتا رہتا ہے ہر وقت یہ دہقان مرا	عمر نیاز تائل
اتنا بروقت ہوا ہے ترا ملنا جیسے	پہلی تاریخ پہ مالک کو کرایہ مل جائے	حارث بلال
ہر گام ظلم و جور ہے، ہر آن کربلا	یہ مرثیے کا دور ہے اور میں غزل سرا!	حسینین فرید

احمد محمود کی کتاب ”رائیگانی“ پر تین ماہ سے آپ کی نگاہ کرم کے منتظر میرے مضمون کی عدم اشاعت کی ”تہیت فرک“ مبارک ہو۔ بالفاظ دیگر پنجابی میں ” تے فر نہ ای سمجھے؟“

راجہ عبدالقیوم

محترمی و مکرمی عمران منظور، نعمان منظور، اعجاز رضوی صاحبان، السلام علیکم

بیاض کے اتنے خوبصورت شمارے کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمایئے۔ میں پہلے بھی کچھ شماروں کے بارے میں اپنی ناقص آرا کا اظہار کر چکا ہوں جو بیاض میں جگہ نہ پا سکیں مگر بقول غالب:
”خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے۔“ زیرِ نظر شمارے کے سارے حصے لاجواب ہیں۔ اس شمارے نے سرورق سے خطوط تک، مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کی توصیف میں اپنا حصہ ڈالوں۔ شاعری کا حصہ بلحاظ بخت بھی بہت صحت مند ہے اس حصے میں میری دو غزلیں شامل کرنے پر بہت ممنون ہوں۔ شاہ داستان بہت رواں اور پُرلطف ہے۔ فکرِ اقبال پر فرح نادر کا تحقیقی مضمون اقبال اور اشتراکیت خاصے کی چیز ہے مضمون نگار نے بڑی عرق ریزی سے بائیں بازو کے ان تنقید نگاروں کے نکتہ نظر کی اقبال ہی کی نثر اور شاعری سے مدلل طور پر تردید کی ہے جو عرصہ دراز سے جان بوجھ کر اقبال کو ایک اشتراکی شاعر کے طور پر پیش کر رہے ہیں کو ان کے اس اندازِ نظر کو بڑے بڑے ماہرینِ اقبال بارہا رد کر چکے ہیں۔ یہ مضمون محترمہ فرح نادر کی فکرِ اقبال پر گہری نظری کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ محترمہ کے مضمون میں حوالہ نمبر 18 غلط درج ہو گیا ہے مذکورہ شعر کلیات اقبال فارسی کے صفحہ نمبر 355 (زبور عجم، صفحہ نمبر ۱۱) پر درج ہے۔ اس کے علاوہ محمد ظہیر بدر کا احمد بشیر پر، محمد معین بلے جعفری کا صفدر ہمدانی پر اور قاسم نقوی پر محمد حنیف پر مضامین میں بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ قاسم نقوی سے پرانی یاد اللہ تھی، میرے کولیگ بھی تھے ان کے یوں اچانک جہانِ فانی سے کوچ کر جانا بہت صدمے کا باعث ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ محمد ارشاد کا مضمون خاصے کی چیز ہے اور بجا طور پر اسے پہلے نمبر پر لگایا گیا ہے۔
افسانوں میں اس بار اعمال بیلا کا ”دوسرا خط“ اسلوب اور طرزِ نگارش کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے منظر نگاری اور نازک ترین خیالات کو زمان و مکان میں یوں سبک روی اور چابکدستی سے فلیش بیک بلکہ فلیش بیک کے اندر فلیش بیک کی فنکارانہ تکنیک کے ذریعے جس کمال خوبی سے دکھایا گیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ سیما پیروز کا افسانہ منزل بھی ہمارے سماجی ماحول کی عکاسی اور نفسیاتی کردار نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ فصیحہ آصف خان کا افسانہ ”لالچ“ اور نور کمال شاہ کا افسانہ ”گڑیا“ بھی ہمارے گمبھیر سماجی مسائل کے گہرے شعور کی بہترین مثالیں ہیں احسان کنعانی کے افسانے کا محمد افتخار شفیع نے عمدہ ترجمہ کیا ہے کہانی بہتر

ہوتا اگر قارئین کے لئے مصنف کا مختصر تعارف بھی شامل کر لیا جاتا۔
خطوط میں نسیم سحر صاحب کا تفصیلی خط، اور طالب انصاری، فرخندہ شمیم، فیضان رسول فیضان، رانا محمد شاہد اور اشرف کمال کے خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ مکتوب نگاروں نے ستمبر کے شمارے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ تجمل اندلیش

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب
السلام علیکم!
اکتوبر کے خوبصورت شمارے کی اشاعت پر مبارک باد قبول کیجئے۔ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ تحریروں کا انتخاب بھی پہلے کی طرح خوب عمدہ ہے۔
سرور حسین نقشبندی کی نعت کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

غنی سارے اسی چشم عطا کی بھیک پاتے ہیں — نبی ہر ایک ان کا ہی دیا تقسیم کرتا ہے

تاریخ کے حوالے سے آصف ثاقب کا مضمون تاریخ (تنسیخ منسوخ) اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں دہلوی اور لکھنوی دبستان کے حوالے سے شاعری کے مزاج اور انداز کی بات کی گئی ہے اور لکھنویت کا دہلویت کے ساتھ تقابل پیش کیا گیا۔
غزلوں کے حوالے سے درج ذیل اشعار نے فوری تاثر قائم کیا۔

نئی رتوں کے لیے کس قدر اداس ہوئے	وہ برگ زرد کہ فٹ پاتھ اک گھاس ہوئے	محمد انیس انصاری
مجھ میں گزر رہا ہے کہ ہے چار سو مرے	مجھ میں ہے واقعہ کہ میں خود واقعے میں ہوں	منظور ثاقب
میں آئینہ خانے کی ادا سیکھ رہا ہوں	زنگار تو ہوتا ہے نظر آتا ہے سادہ	افتخار شاہد
اب بھی اس آنکھ کی تصویر پڑی ہے مجھ میں	اک محبت بھری تحریر پڑی ہے مجھ میں	افتخار شوکت
یہ حق ہے رہ میں زمانہ پڑے گا	مگر تم سے ملنے تو آنا پڑے گا	راجہ عبدالقیوم
بہار میں کسی شاخ پہ نہ آئے پھول	مگر وہ آیا تو کھل کر مسکرائے پھول	صغیر احمد صغیر

نظموں کا انتخاب اپنی جگہ اہم ہے۔ خالد احمد کی نظم ”جغرافیے کی کتاب کا پہلا ورق“، امجد اسلام امجد کی نظم ”کوئی الجھن تمہارے بعد نہیں“، رخشندہ نوید کی نظم ”روتا بچہ“ اور اعجاز رضوی کی نظم ”انہدام“ خوب ہے:
دل سنبھالوں تو آنکھ گرتی ہے / آنکھ جوڑوں تو سر چٹختا ہے / سر پکڑتا ہوں دھڑ سمٹتا ہے / میرے اعصاب جس نے جوڑے تھے / اپنی باتوں سے مجھ کو توڑ گیا / کیسے کیسے وہ حرف بول گیا
آخر میں خالد احمد کا شعر اپنی جگہ معرفت کے کئی بھید لیے ہوئے ہے:

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ غیب، خبر سے

خدا کرے کہ ماہنامہ بیاض اسی طرح نظم وغزل اور نثر کے پھول کھلاتا رہے۔

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب آداب!
اکتوبر کا بیاض خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ حسن فطرت کی بے ساختہ معصومیت کو معترز پرندے میں مجسم دیکھ کر اپنے دو شعر یاد آئے:

شکاری دندناتے پھر رہے ہیں — پرندے سر چھپاتے پھر رہے ہیں
پرندے خوف سے ہی بھر کر جان دے دیں گے — شکاری سے کہو تیروں کو بے ذرے کمانوں میں

نو مطبوعہ کتابوں کے ٹائٹل برائے تعارف تازہ، جمال افزا ہیں۔ بانی مدیر حضرت خالد احمد کی دو مصرعی نظم، آدھا سچ، بلاغت کا مرقع ہے:

جیسے بھاں جاگتے ہی جانے کیا ہوا
پتھر کی طرح میں ترے آنگن میں آ گرا

اگر شاعری امیجری ہے تو یہ بیت الادب، جہانِ معنی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

محمد ارشاد صاحب کا مضمون، یاد ایامے کی علم و ادب، شعر و سخن، تنقید و تحقیق اور تاریخ و تہذیب کا بحرِ ذخار ہے۔ مالک انھیں سلامت رکھے۔

علی عباس جلالپوری، مسلک بیدار اور جدید ترقی پسند ہیں جو آج کے چاچہ برانڈ سرخوں کی طرح نہ تو مذہب پر تبرا کرتے ہیں اور نہ ہی اقبال کو گالی دیتے ہیں۔ شدت میں اُن کی تصنیف، اقبال کا علم الکلام، دیکھی جا سکتی ہے۔ جناب ارشاد کی طرح جناب جلالپوری بھی اختلاف کے باوجود، حقیقی ترفع کے اعتراف میں ذرہ بھر تاخیر نہیں کرتے۔ بڑے لوگ، بڑی باتیں۔

محمد حنیف نے قائم نقوی کو محبت بھرا اور دردمندانہ خراجِ اعزاز پیش کیا ہے۔ جو خاصا معلومات افزا بھی ہے۔ نقوی صاحب کا ایک عمدہ شعر

سچ کو سچ لکھنے سے قائم ہم اکثر گھبرائے ہیں
جانے کتنے جھوٹ گھڑے تو دانش ور کہلائے ہیں

محمد ظہیر بدر نے احمد بشیر — مکاتیب کے آئینے میں، لکھ کر ثابت کیا ہے کہ کمیونسٹ برانڈ تحقیق نگار بھی، ملحد محض نہیں ہوتے بل کہ وہ مرحوم بھی وحیال وارِ زندگی میں انھیں بھی قدم قدم پر یادِ خدا سے علاقہ رہتا ہے۔ حالی یاد آئے:

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب و جلال تیرا

نیلم و بشریٰ کے والد، احمد بشیر (مرحوم) کی صاف گوئی و بے باکی: خاصے کی چیز ہے۔

ظفر معین بلے جعفری نے، صفدر ہمدانی کی ادب کہانی، میں میری معاصر نسل کی اُن خوشگوار یادوں کو تازہ کیا ہے جب ہم لوگ، مہ پارہ صفدر کے خبرنامے سے اپنے لہجے کے شین، قاف درست کیا کرتے تھے۔ اور جب ابھی چینلوں نے کچرا کنڈی اور مچھلی منڈی کا روپ نہیں دھارا تھا بل کہ خصوصاً پی ٹی وی سے جب تہذیبی فروغ اور اخلاقی نکھار کا کام لیا جاتا تھا۔ تحسین و آفریں۔ صفدر صاحب کے دو پایدار شعر:

تفسیر تیری ذات، رہِ مستقیم کی
جنت کا راستہ ہے ترا راستہ حسینؑ
ہوتی نہیں قبول کبھی جب دعا مری
دیتا ہوں میں خدا کو ترا واسطہ حسینؑ

بابائے ادب جناب آصف ثاقب کا، ناسخ پر اردو شذرہ، کئی کتابوں کا نچوڑ ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے نمایندہ سخنور، شیخ امام بخش ناسخ اس حوالے سے مظلوم ہیں کہ انھیں اکثر و بیشتر، لفظی مداری اور لسانی بازی گری بتایا جاتا ہے مگر ثاقب صاحب نے مدلّل تردید سے کمال کر دکھایا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے جلیل قدوائی کی، انتخاب شعرائے بدنام، بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

قدوائی صاحب کا ایک لازوال شعر:

اِک اور زندگی بھی عمل کے لئے ملے
یہ زندگی تو نیک ارادوں میں کٹ گئی

ناسخ کا ایک قیامت شعر:

جائے کافورِ سحر، چاہیے کافور حنوط
یہ شبِ ہجر ہے یارو، شبِ دیجور نہیں

فرخ نادر نے، اقبال اور اشتراکیت، میں موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ مضمون کا مطالعہ، متعلقہ کئی کتب سے بے نیاز کرنے کو کافی ہے۔ ڈھیروں داد۔

فیصل زمان چشتی نے ڈاکٹر خالدہ انور کی شاعری پر شان دار محاکمہ قلم بند کیا ہے۔ موصوفہ کا ایک جان دار شعر:

کم نسب مدِ مقابل ہو تو چوکس رہنا
جیت کے بعد بھی تلوار کو باندھے رکھنا

بزرگ شاعر، عقیل رحمانی پر خالق آرزو کا مضمون، اختصار و جامعیت کا آمیزہ ہے۔ رحمانی صاحب کا ایک عقیدت مند شعر:

وہ سوکھے چمن کو دیتا ہے رنگ پھولوں کا
وہ اپنے فضل سے تتلی کے پر نکالتا ہے

معمول کے دیگر سلسلے بھی معیار کا شہکار ہیں۔ الحمدللہ، میرا اردو مجموعۂ نعت "بابِ فیضان" شائع ہو چکا ہے۔ جلد ہی ارسالِ خدمت کروں گا۔

حافظ عبداللہ اور دیگر احباب کو سلام نیاز۔ ایک غزل اور منتخب اشعار کے ساتھ اجازت۔ والسلام۔

ہم تو اپنی ذات میں اُلجھے رہتے ہیں
ہر اچھی تدبیر خدا ہی رہتا ہے
سرور حسین نقشبندی

یہ مجھ سے گنہگار پہ ہے آپ کی رحمت
میں نعت کہوں؟ کیا مری اوقات نبی جیؐ
سید عارف معین بلے

کسی سطلے سے بھی دل کی حقیقت مت کہہ
کسی چھلنی میں ٹھہر سکتا ہے پانی کب تک
احمد اسلام امجد

میں ہی ہدف بنا ہوں کوئی اور ہو تو ہو
چلنے کو اب ہے تیرِ قضا، قصہ مختصر
حسن عسکری کاظمی

ابھی عزت بچا سکتے ہو اپنی — ابھی تو صرف مال و زر گیا ہے — خاور اعجاز
تا میں کیا کروں اس زندگی کا — جو مرنے کے لئے مجبور کر دے — راحت سرحدی
تو پھر یہ بادلوں کی اوٹ کیسی — اگر مہتاب کھلنا چاہتا ہے — یعقوب پرواز
اس نے تو سب سے پہلے کیا میرا پتہ صاف — میرا یہ وہم تھا اُسے میرا تھا خیال — سعد اللہ شاہ
آنکھیں خمار آگیں چہرہ کھلا کھلا سا — آواز میں کھنک سی لہجہ وہ رس بھرا سا — سلطان سکون
اپنی باتوں سے مجھ کو توڑ گیا — کیسے کیسے وہ حرف بول گیا — اعجاز رضوی

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

اکتوبر کا ''بیاض'' ایک دلکش آرکیٹیکٹ پرندے کے سرورق کے ساتھ ملا۔ جو اپنا گھونسلہ تیار کر رہا ہے۔ ویسے بیاؔ نامی پرندے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جسامت میں عام چڑیا کے برابر یہ پرندہ مختلف تنکوں، گھاس وغیرہ کو اپنی چونچ سے بُن کر اپنا آشیانہ تیار کرتا ہے۔ محمد ارشاد صاحب کا مضمون ''یاد آیا ہے کہ'' ہمیں کچھ دیر کے لیے احمد ندیم قاسمی، منصور احمد اور ان کے رفقائے کار کے دور میں لے گیا۔ میرے خیال میں قاسمی صاحب نے نئے لکھنے والوں کے لیے جو محبت و اپنائیت رکھی اور اُن سے کہہ کہہ کے لکھوایا۔ اسی روایت کو بعد میں خالد احمد نے نبھایا۔

ارشاد صاحب کے خطوط نے بھی اس ادب نواز دور کی یادیں تازہ کر دیں۔ محمد حنیف نے ستائش و تمنا سے بے نیاز شاعر قائم نقوی کی شخصیت پہ دلچسپ خاکہ لکھا:

یہاں دو باتوں کی تصحیح ضروری سمجھتا ہوں۔ میری غزل کے شعر نمبر 4 کے دوسرے مصرعے میں لفظ ''تھی'' آیا ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

سخن میرا کانوں میں رس گھولتا ہے — محبت کو میں نے ہے شعروں میں ڈھالا

اسی طرح خط میں قائم نقوی کا شعر غلط چھپ گیا ہے۔ شعر یوں ہے:

ہمارا قتل ہوا دفتروں کی کربل میں — ہم اپنے نقش فقط فائلوں میں ڈھونڈتے ہیں

نظموں میں امجد اسلام امجد کی ''کوئی اُلجھن نہیں تمہارے بعد'' اور حامد یزدانی کی ''یمم ٹوبی کے لیے ایک نظم'' پسند آئیں۔ عاطف جاوید عاطف کی ''تم کہاں تھے'' حالیہ سیلاب کے تناظر میں لکھی گئی ایک نظم پسند آئیں۔ عاطف جاوید عاطف کی ''تم کہاں تھے'' حالیہ سیلاب کے تناظر میں لکھی گئی ایک بہترین نظم تھی۔ نظم پڑھتے ہوئے لگا جیسے یہ پہلے بھی کئی بار سماعتوں سے ٹکرائی ہے۔ اس دوران ٹیوپ ایک نیوز پروگرام کے وقفے میں یہ نظم پھر سے سنی تو یاد آگیا کہ کب کب اور کہاں سنی تھی۔ بہر حال سیلاب زدگان کے احساسات و جذبات کا اظہار کرتی عاطف جاوید عاطف کی ایک منفرد نظم تھی۔ اب آخر میں جو غزلیں پڑھی ہیں اُن کے کچھ پسندیدہ اشعار:

جو بھی منظر ہو اُسے ڈوب تو جانا ہے کبھی — تا کجا موسمِ غم، شام سہانی کب تک
آپ کی اپنی بھی پہچان کوئی ہے کہ نہیں — کام آئے گی یہ آبا کی نشانی کب تک — امجد اسلام امجد
مجھی انجام نظر آتا تھا اس عجلت کا — دل میں اترے بھی نظروں سے اترنے لگے ہو — خاور اعجاز
اپنے اشعار پہ میں نے جو کبھی غور کیا — اک معانی کا سمندر مری تحریر میں ہے — اقبال سروبہ
دیکھتے ہی دیکھتے سارے حجاب اُٹھ جائیں گے — کوئی شدت بھی تو آئے خواہشِ دیدار میں — طالب انصاری

صفحہ 126 پہ موجود سعد اللہ شاہ کی پوری غزل ہی کمال کی تھی۔

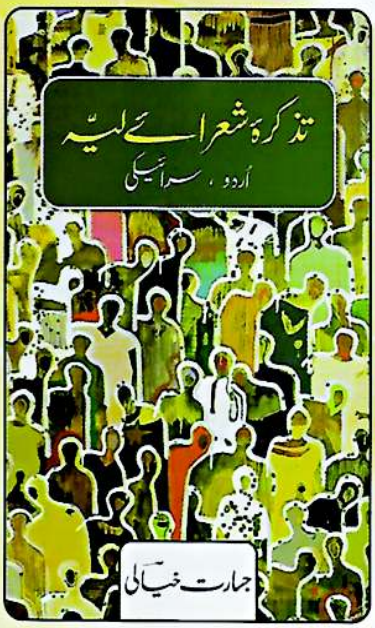
تذکرہ شعرائے لیہ
اردو ، سرائیکی
جمارت خیالی

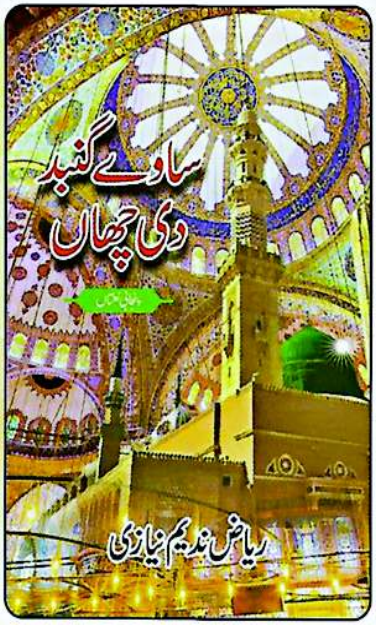
ساوے گنبد
دی چھاں
ریاض ندیم نیازی

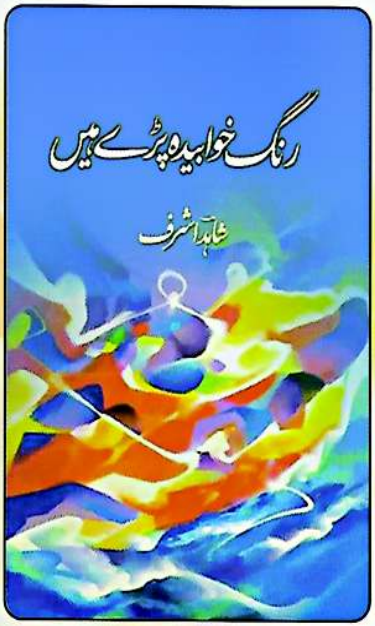
رنگ خوابیدہ پڑے ہیں
شاہد اشرف

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں

کوئی دَم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

علامہ محمد اقبالؒ

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں ، جہاں تک دیکھوں
حُسنِ یزداں سے تُجھے حُسنِ بُتاں تک دیکھوں

تُو نے یُوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
مَیں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

فقط اس شوق میں پُوچھی ہیں ہزاروں باتیں
مَیں ترا حُسن ، ترے حُسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانۂ جاں میں ، ترے غم کے دم سے
پُھول کِھلتے نظر آتے ہیں ، جہاں تک دیکھوں

وقت نے ذہن میں دھندلا دیئے ترے خدوخال
یُوں تو مَیں ٹوٹتے تاروں کا دُھواں تک دیکھوں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
مَیں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

احمد ندیم قاسمی